# پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد

آج سے بارہ سال پیشتر ہماری کتاب ''ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار ونظریات تنقید کی میزان میں'' شائع ہوئی تھی۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ کتاب نایاب ہوگئی۔ اس دوران ناشر کو بھی کسی دہشت گرد نے شہید کر دیا۔ اس لئے کتاب کی مزید طباعت و اشاعت رکی رہی۔ کتاب کچھ ضخیم تھی اور اندازہ ہوا کہ ایسے موضوعات پر ضخیم کتاب کی طرف عام لوگوں کی رغبت بہت ہی کم ہوتی ہے اس لئے بہت عرصہ سے خیال تھا کہ کتاب کی تلخیص کر کے پھر شائع کیا جائے۔ جامعہ میں عید الاضحیٰ کی تعطیلات کی وجہ سے کچھ فرصت ملی تو تلخیص کرنے کا موقع بھی ملا۔ غرض تو فقط دین کا دفاع اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہے۔ افسوس ہے کہ کیسے کیسے باصلاحیت لوگ کسی بھی وجہ سے راہ اعتدال سے ہٹ کر کن کن غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور امت کو خالص نفع پہنچانے کے بجائے کچھ نفع کے ساتھ بہت سی گمراہیوں اور بے اعتدالیوں کی ملاوٹ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ اگر وہ اور ان کے ساتھی ہماری ان گزارشات کو قبول کریں اور ان کے مطابق اپنی اصلاح کریں تو خود ان کے لئے بھی خیر ہوگی اور امت کا بھی کچھ بھلا ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوشش کو قبول فرما کر اس کا ثواب ہمارے اساتذہ اور والدین کو عطا فرمائیں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب۔

عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ۔ لاہور

ذوالحجہ 1422ھ

# فہرست مضامین

# باب:1

## ڈاکٹر اسرار صاحب دینی جماعت کی قیادت کے اہل نہیں

کسی دینی تحریک و جماعت کے سربراہ کے لئے ضروری اوصاف جو شخص کسی دینی جماعت یا تحریک کا سربراہ ہو خاص طور سے جس جماعت یا تحریک کا نصب العین اجتماعی اصلاح یا انقلاب برپا کرنے کی کوشش ہو تو چونکہ اس نے کار نبوت کو اختیار کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں کام کے لئے ضروری اوصاف نبوت بھی ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔

**ان قـام بـه رجل و حده قتل و لم يصلح للناس امر و لكن ان وجد عليه اعوانا صالحين و رجلا يراس عليهم مامونا على دين الله لا يحول ﴿احكام القران للجصاص ج 2 بحث الامر بالمعروف و النهى عن المنكر﴾**

اگر قوت کے ساتھ حکومت کی برائیوں کو روکنے کے لئے کوئی شخص تنہا کھڑا ہوگا تو وہ توقتل کر دیا جائے گا اور لوگوں کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ البتہ یہ صورت ہے کہ اس کام کی سرانجامی میں کچھ اچھے صالح لوگ مددگار بن جائیں اور ان لوگوں کا سربراہ کوئی ایسا شخص ہو جو جس کے دین پر امن ہو (کہ پورے طور پر راہ حق میں اس نے اتنی ریاضت کر لی ہو کہ) اب اس کے بدلنے (اور اصول وفروع میں راہ حق سے پھسلنے) کا اندیشہ نہ ہو۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے جب حضرت زید بن علیؓ کی حمایت کا اعلان کیا تو یوں فرمایا۔

**﴿شاهدت زيد بن على كما شاهدت اهله فما رأيت فى زمانه افقه منه ولا اعلم ......﴾**

میں نے زید بن علی کو دیکھا ہے جیسا کہ میں نے ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو دیکھا ہے میں نے ان سے بڑھ کر فقیہ اور عالم کوئی نہیں پایا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن وحدیث کے بڑے ماہر اور بڑے مجتہد تھے۔ انہوں نے یہ بات بطور ضابطہ کے ذکر کی ہے جو انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں معلوم کی۔ وہ ضابطہ یہ ہے کہ کسی دینی تحریک وجماعت کا سربراہ ایسا شخص ہونا چاہیئے جو فقیہ وعالم ہو اور اہل حق کو اس کے دین کے بارے میں پورا اطمینان ہو اور ان کو اس کے دین میں راہ حق سے پھسلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فقیہ وہ شخص ہوتا ہے جس کو نفس کے نفع ونقصان کی باتوں کی معرفت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں عمل نہ ہو تو اس کو علم ہی شمار نہیں کیا جاتا اور علم کے بھی صرف اس درجے کا اعتبار ہوتا ہے جو آدمی کے اندر رچ بس جائے اور آدمی کو اپنے تقاضے پورے کرنے پر از خود مجبور کر دے۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دین کے علم کا سلسلہ تلمذ نبی ﷺ کے دور سے جاری ہے۔ نبی ﷺ سے صحابہ نے سیکھا اور صحابہ سے تابعین نے سیکھا اور تابعین سے تبع تابعین نے سیکھا اور نسل در نسل یہ سلسلہ چلا آیا ہے۔ اسی طریقے سے دین کی باتوں کے صحیح صحیح مفاہم ومطالب نقل درنقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ کوئی شخص دینی علوم مثلاً حدیث، تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابوں کا محض خود ذاتی مطالعہ کر لے تو اس پر اطمینان نہیں ہوسکتا کہ اس نے صحیح مفہوم بھی سمجھا ہے یا نہیں۔ علاوہ ازیں اسی سلسلہ تلمذ میں سے کسی نے اگر سلف صالحین اور خیر القرون کے طریقے کو کسی بھی معاملہ میں ترک کیا تو وہ بدعتی ہے اور اس سے آگے چلنے والا سلسلہ تلمذ قابل اعتبار نہ ٹھہرے گا۔

لہٰذا یہاں فقیہ وعالم سے وہ شخص مراد ہے جس نے علمائے ربانیین سے دین کے اصول وفروع کا مکمل علم حاصل کیا ہو اور ان سے اپنا تزکیہ نفس کرایا ہو اور انہوں نے اس کے علم اور ایمان ودین پر امن واطمینان کا اظہار کیا ہو۔

یہ ضابطہ ہے ان اوصاف نبوت کا جو کہ کار نبوت کے لئے بمنزلہ شرط کے ہیں۔ اگر کسی میں یہ ضابطہ مفقود ہو تو وہ ایسی سربراہی کے لائق نہیں۔ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر اسرار صاحب ہی کے بارے میں جو

بات کہی اس میں مزید وضاحت ہے۔ لکھتے ہیں:
''پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور ارباب باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی اصلاح نہ کی ہو اس کے بارے میں یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے گا اور وہ کسی افراط و تفریط، خود رائی و کجروی کا شکار نہیں ہوگا۔

ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا، جس نے کسی مرد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا، جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا، جس نے کتاب وسنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا، جس نے اپنے علم و عمل عقائد ونظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوہ نبوی میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے (کیا) وہ دینی قیادت کا منصب سنبھال سکتا ہے''۔

ڈاکٹر اسرار صاحب مذکورہ بالا اوصاف کو ضروری نہیں سمجھتے کسی دینی تحریک کے سربراہ کے لئے جو ضروری اوصاف اوپر ذکر ہوئے ڈاکٹر اسرار صاحب ان کا خلاصہ یہ نکالتے ہیں: ایک یہ کہ وہ باضابطہ اور مستند عالم دین ہو اور دوسرے یہ کہ متقی اور مزکی ہو (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی 522)

لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب ان اوصاف کو ضروری نہیں سمجھتے اور لکھتے ہیں۔
''ان میں سے دوسری چیز (یعنی تزکیہ نفس) تو کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آخری تجزیے میں شرط واحد یہ رہ جاتی ہے کہ علم دین کا حصول مروجہ معیارات کے مطابق ہوا اور مسلمۃ المقام علماء سے سند فراغت حاصل کی ہو، اس پر سب سے پہلی گزارش تو راقم کی یہ ہے کہ کسی ایک ہی ایسے بڑے فتنے کا نام بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والے مستند عالم دین اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہوں۔

چنانچہ کیا مسلم انڈیا کی تاریخ کے سب سے بڑے فتنے یعنی دین الٰہی کے مصنف ابوالفضل اور فیضی مسلم عالم دین نہ تھے۔ اسی طرح عہد حاضر کے عظیم فتنوں کے بانیوں میں سے کیا سرسید احمد خان مرحوم وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق عالم دین اور بہترین علماء کے فیض یافتہ نہ تھے؟ کیا نورالدین بھیروی نے وقت کے چوٹی کے علماء سے کسب علم نہیں کیا تھا (اور واضح رہے کہ غلام احمد قادیانی کی گمراہی میں اصل دخل اسی شخص کو حاصل تھا) کیا مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیراجپوری علماء میں سے نہ تھے؟ (غلام احمد پرویز کا ذکر چھوڑ دیجئے کہ وہ ان ہی اصحاب ثلاثہ یعنی سرسید، علامہ جیراجپوری اور عبداللہ چکڑالوی کا خوشہ چین ہے خود کچھ نہیں)

مزید قریب آ کر دیکھئے کیا مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے سند یافتہ فارغ التحصیل اور پھر علامہ فراہیؒ ایسے محقق قرآن اور محدث مبارکپوریؒ ایسے عالم وشارح حدیث نبویؐ کے فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قریب کی مثال درکار ہو تو کیا ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی باضابطہ سند یافتہ ''فاضل علوم دینیہ'' اور خود حضرت مولانا بنوریؒ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ہدایت وضلالت کا دارومدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے۔ ایک انسان کی اپنی نیت و ارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق وتیسیر۔ اگر انسان کے اپنے دل میں کجی اور نیت میں فتور ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنت کے مطابق کہ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ اس سے توفیق خیر سلب فرما لے تو ایسا انسان جتنا بڑا عالم وفاضل ہوگا اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھائے گا۔ بلکہ بڑے فتنے تو بڑے علماء وفضلاء ہی اٹھا سکتے ہیں۔ غریب عامی وامی انسان فتنہ اٹھانا چاہے گا بھی تو کوئی بڑا فتنہ کیسے اٹھائے گا۔ یہی بات علماء کرام مولانا رومؒ کے اسی شعر کے حوالے سے بیان کیا کرتے ہیں کہ ؎

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

اور یہی بات آنحضورؐ کے اس قول میں وارد ہوئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمانوں کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے۔ فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے''**او کما قال** ﷺ''(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی 523)

ڈاکٹر اسرار صاحب کی بات متعدد وجوہات سے غلط ہے۔

1- ڈاکٹر اسرار صاحب نے مولانا روم رحمہ اللہ کا جو شعر نقل کیا ہے اس سے تو علم اور تزکیہ نفس دونوں ہی کی ضرورت معلوم ہوئی۔ مولانا یہی تو بتا رہے ہیں کہ تنہا علم جب کہ وہ تزکیہ قلب اور عمل سے خالی ہو سانپ کی طرح مضر ہے۔ البتہ جس شخص کو علم کے ساتھ تزکیہ نفس بھی حاصل ہو جائے وہ اللہ کا دوست اور ولی بن جاتا ہے۔ اسی کو حدیث میں علم نافع کہا گیا ہے۔ غرض مولانا روم رحمہ اللہ تو علم اور تزکیہ نفس دونوں کو ضروری بتا رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو حدیث نقل کی ہے کہ'' آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے'' اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تنہا علم جب تزکیہ نفس اور خدا خوفی سے خالی ہو تو وہ فتنوں کی آماجگاہ ہے۔

اس کے باوجود ڈاکٹر اسرار صاحب۔ تزکیہ نفس (جس سے خدا خوفی حاصل ہوتی ہے اور حب جاہ وحب مال اور نفس امارہ کے رزائل سے نجات حاصل ہوتی ہے) کو یوں کہہ کر بڑی آسانی سے نظر انداز کرتے ہیں کہ'' یہ چیز کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہوسکتا''۔ حالانکہ خود قرآن پاک میں رسول اللہ ﷺ کا ایک منصب یہ بھی بتایا کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اور تعلیم قرآن کی طرح تزکیہ نفس کا سلسلہ امت میں تسلسل سے چلا آیا ہے۔ جس طرح ظاہری علم میں جب امتحان کے ذریعہ طالب علم کی استعداد کے پختہ اور صحیح ہونے کا پتہ چلتا ہے اسی طرح آثار واحوال دیکھ کر تزکیہ نفس کی راہ سلوک پر چلنے والوں کے بارے میں اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب میں اگر اس کو ناپ تول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ اس لائن اور فن والوں کو بھی یہ صلاحیت حاصل نہ ہو۔ آخر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حضرت زید شہید رحمہ اللہ کے بارے میں جو گواہی دی اس میں یہ ہے ما رایت فی زمانہ افقہ منہ (میں نے ان کو ان کے زمانہ کا فقیہ ترین شخص پایا) جب کہ فقہ سے ان کی مراد ہے معرفۃ النفس مالھا و ماعلیھا یعنی نفس کا (خصوصاً آخرت کے اعتبار سے) اپنے فائدے اور نقصان کی چیزوں کو جاننا اور ان پر پوری طرح عمل پیرا ہونا۔ تزکیہ نفس کا اندازہ کر کے اور اس کو پوری طرح ناپ تول کر ہی امام صاحب نے حضرت زید شہید رحمہ اللہ کے بارے میں فقیہ ترین ہونے کی گواہی دی۔

2- ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ''ہدایت وضلالت کا دارومدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے ایک انسان کی اپنی نیت وارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق وتیسیر''۔

ہم کہتے ہیں نیت وارادہ کی درستگی کے لئے بھی علم وتزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ کس بات کا ارادہ کرنا جائز ہے اور کس کا نہیں اور آیا حالات کے بدلنے سے اس میں کوئی تغیر آتا ہے یا نہیں ان سب باتوں کا پتہ علم سے ہوگا۔ پھر علم کے بعد حب مال یا حب جاہ یا نفس پرستی آدمی کے ارادہ کو خراب نہ کرے یہ بات تزکیہ نفس سے حاصل ہوگی۔

توفیق کا مطلب ہے اسباب کو عمل خیر کے موافق کرنا اور تیسیر کا مطلب ہے عمل خیر کرنے کو آدمی پر آسان کرنا۔ اب یہ جاننے کے لئے کہ جو بات ہم کریں گے یا جو عمل ہم کریں گے وہ خیر ہے یا نہیں اس کے لئے علم کی ضرورت ہے اور یہ کہ اس کے کرنے میں کوئی شر شامل نہ ہو جائے اس کے لئے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے۔ عمل خیر کے لئے صحیح علم بھی ہو جائے اور ضروری تزکیہ بھی حاصل ہو جائے یہ بھی توفیق وتیسیر کا حصہ ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب اتنی بنیادی بات نہیں سمجھے تو وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کریں گے۔
مزید بریں ڈاکٹر صاحب کا یہ اعتراض عقل کی رو سے بھی صحیح نہیں کیونکہ جیسے بعض بظاہر ماہرین کی

MALPRACTICE سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہارت کی شرط ہی اڑا دی جائے اور عطائیوں کو بھی PRACTICE کرنے کی سند دے دی جائے۔ ایسے ہی بعض بظاہر اہل علم کی گمراہی سے اور ان کے سبب فتنہ بننے سے یہ گنجائش نہیں نکلتی کہ بے علم یا کم علم لوگوں کے لئے لاعلمی یا کم علمی مانع نہ رہی بلکہ جیسے MALPRACTICE سے بچاؤ کے لئے شرط مہارت کی تاکید اور مزید کچھ ضوابط کی پابندی کرائی جاتی ہے ایسے ہی گمراہی وفتنہ سے بچاؤ کے لئے علم میں مہارت کی شرط کی تاکید کی جائے گی اور ساتھ ہی تزکیہ وغیرہ پر زور دیا جائے گا یہاں تک کہ عادت کے مطابق اس شخص کے دین پر امن محسوس ہونے لگے۔

شیطان کے اغوا سے اگرچہ کسی دور و مرحلہ میں بھی امن نہیں لیکن عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو شخص علم میں کمال حاصل کر لے اور اپنا تزکیہ باطن کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتے ہیں بلکہ کمال علم وغیرہ عام طور پر ایسے ہی شخص کو حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے۔ **من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** (جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں اور فقہ کا مطلب جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ ہے۔ معرفۃ النفس مالھا وماعلیھا (نفس کا اپنے فائدے اور نقصان والے امور کو پہچاننا) جس میں علم ظاہر اور تزکیہ باطن دونوں شامل ہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ ﷺ **ان اللّٰہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من العباد و لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جھالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا و** اضلوا۔ (بخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو کھینچ کر نہیں اٹھاتے کہ بندوں کے سینوں سے اس کو کھینچ کر نکال لیں بلکہ علم کو اٹھاتے ہیں علماء کو (موت دے کر) اٹھانے کے ساتھ یہاں تک کہ

جب اللہ تعالیٰ (پختہ کار اور ماہر) علماء نہ چھوڑیں گے (اور وہ بہت کم ہو جائیں گے یا ختم ہو جائیں گے) تو لوگ جاہلوں کو (جنہوں نے علمائے راسخین سے علم حاصل نہ کیا ہوگا بلکہ ادھرادھر سے اپنا مطالعہ کر کے کچا پکا علم حاصل کیا ہوگا ان کو) بڑا بنالیں گے اور ان سے دین کی باتیں پوچھی جائیں گی (اور ان سے قرآن کے درس کہلوائے جائیں گے) تو یہ (پختہ) علم کے بغیر دین کے مسائل بتائیں گے (اور قرآن کی تفسیر اپنی طرف سے کریں گے) پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دیکھئے رسول اللہ ﷺ جہالت و لاعلمی کو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کا سبب بتا رہے ہیں۔ تو اگر اس کے مقابلہ میں کوئی یہ کہے کہ واقعہ یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دارومدار علم پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے......تو ہمیں تو ڈر ہے کہ اس حدیث مبارکہ کا مصداق تو بالکل نقد سامنے آ رہا ہے اور ہمارے اس خوف پر مزید شواہد بھی موجود ہیں۔

2- ہمیں حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی کہ کوئی ایسا بڑا فتنہ بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والا مستند عالم دین اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام کا فیض یافتہ نہ ہو۔ لیجئے ان ہی کے پیشوا مودودی صاحب کا اٹھایا ہوا فتنہ اور ان کا پورا لٹریچر اور اس کو قبول کرنے والی جماعت۔

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کا قلم ہمارے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے۔
''......لیکن اتنا اندازہ نہ تھا کہ یہ فتنہ عالمگیر صورت اختیار کرے گا اور اکثر عرب ممالک میں یہ فتنہ بری صورت اختیار کرے گا اور دن بدن ان کے شاہکار قلم سے نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہیں گے۔ صحابہ کرام اور انبیا کرام علیہم السلام کے حق میں ناشائستہ الفاظ استعمال ہوں گے۔ آخر تفہیم القرآن اور خلافت و ملوکیت اور ترجمان القرآن میں روز بروز ایسی چیزیں نظر آئیں کہ اب معلوم ہوا کہ بلاشبہ ان کی تحریرات و تالیفات عہد حاضر کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اگر چہ چند مفید ابحاث بھی آ گئی ہیں۔ **وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا** والی بات ہے۔

اب حالت یہاں پہنچ گئی ہے کہ سکوت جرم عظیم معلوم ہوتا ہے اور چالیس سال جو مجرمانہ سکوت کیا اس پر بھی افسوس ہوا اور اب وقت آ گیا ہے کہ بلا خوف لومۃ لائم الف سے یاء تک ان کی تالیفات وتحریرات کو مطالعہ کر کے جو حق وانصاف ودین کی حفاظت کا تقاضا ہو وہ پورا کیا جائے۔ واللہ سبحانہ ولی التوفیق، ص 58 (مودودی صاحب اور ان کی تحریرات کے متعلق چند اہم مضامین)

مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ جن کے تقوے کے ڈاکٹر صاحب بھی معترف ہیں (دیکھئے ص 27 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی) وہ مودودی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ جماعت گمراہ جماعت ہے۔ اس کے عقائد اہل سنت والجماعت اور قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔ اس جماعت کی کوشش اس اسلام کے لئے نہیں جو کہ حقیقی ہے بلکہ ایک نام نہاد مودودی صاحب کے اختراعی اور نئے اسلام کے لئے ہے۔ یہ لوگ عام مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور اپنا ہمدم بنانے کے لئے اسلام اور دین کا نام لیتے ہیں۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اصلی اور دیندار ہیں۔ ان کے رسالوں اور کتابوں میں دینی پیرائے میں وہ بددینی اور الحاد کی باتیں مندرج ہیں جن کو ظاہر بین اور ناواقف انسان سمجھ نہیں سکتا اور بالآخر اس اسلام سے جس کو رسول اللہ ﷺ لائے تھے اور امت محمدیہ جس پر ساڑھے تیرہ سو برس سے عمل پیرا رہی ہے بالکل علیحدہ اور بیزار ہو جاتا ہے۔ آپ حضرات سے امیدوار ہوں کہ اس فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے سکوت اور غفلت اور چشم پوشی کو روا نہ رکھیں''۔

مودودی صاحب کے مستند عالم اور مسلم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہونے کی شہادت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ سے سنیئے:

''اس قسم کے لوگوں میں سے آج کل کی ایک مشہور شخصیت جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے جو بچپن ہی سے طباع وذہین مگر معاشی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ابتداء میں اخبار بجنور میں ملازم ہوئے اور پھر دہلی میں جمعیت علماء ہند کے اخبار مسلم سے وابستہ رہے پھر چند سالوں کے بعد اخبار الجمعیۃ دہلی میں ملازم ہوئے جو جمعیت علماء ہند کا ترجمان تھا دہلی سے نکلتا تھا

غالبًا سہ روزہ تھا۔ تاریخ کے جواہر پاروں کے عنوان سے ان کے مضامین بہت آب و تاب سے نکلتے تھے۔ اس طرح مودودی صاحب کی قلمی تربیت مولانا احمد سعید صاحب کے ذریعہ ہوتی گئی۔

والد مرحوم کی وفات کی وجہ سے اپنی تعلیم نہ صرف یہ کہ مکمل نہ کر سکے بلکہ بالکل ابتدائی عربی تعلیم کی کتابوں میں رہ گئے، نہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو سکے۔ پرائیویٹ انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی سے کچھ مناسبت ہوگئی۔ اس دور کے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریرات اور مجلّات و جرائد سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا اور قلمی قابلیت روز افزوں ہوتی گئی۔ بدقسمتی سے نہ کسی دینی درسگاہ سے فیض حاصل کر سکے نہ جدید علوم کے گریجویٹ بن سکے، نہ کسی پختہ کار عالم دین کی صحبت نصیب ہو سکی اور ایک مضمون میں خود اس کا اعتراف کیا ہے جو عرصہ ہوا کہ ہندوستان متحدہ میں مولانا عبدالحق مدنی مراد آبادی کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ بلکہ بدقسمتی سے نیاز فتح پوری جیسے ملحد و زندیق کی صحبت نصیب رہی ان کی صحبت و رفاقت سے بہت کچھ غلط رجحانات و میلانات پیدا ہو گئے ......'' (ص 54 مودودی صاحب اور ان کی تحریرات سے متعلق چند اہم مضامین )۔

تنبیہ -1 : عجیب اتفاق دیکھئے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے جتنے فتنہ گروں کے نام گنوائے ہیں ان میں فتنہ کی جڑ پہلے سے موجود تھی یعنی اجتہاد کی اہلیت نہ ہونے کے باوجود ترک تقلید اور اپنے کو کسی دوسرے اہل اجتہاد کی رہنمائی کا محتاج نہ سمجھنا۔ جب اپنے اندر اہلیت و صلاحیت نہ ہو اور دوسرے اہل کی رہنمائی بھی قبول نہ کرے تو اس بات کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ ایسے لوگ فتنے ہی اٹھائیں گے اور شیطان کے آلہ کار بنیں گے۔

یہی مرض مودودی صاحب میں بھی تھا اور اسی مرض کو ڈاکٹر اسرار صاحب بھی اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے ہیں بلکہ اپنی جماعت کے لئے بھی اس کو پسند کرتے ہیں اور وہ چونکہ اس کو مرض ہی نہیں سمجھتے بلکہ ایک نوع کا کمال سمجھتے ہیں اس لئے وہ اپنے مرض کی صحیح تشخیص کرنے سے عاجز ہیں۔

تنبیہ -2: یہاں جو یہ ذکر کیا گیا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب میں دینی قیادت کے ضروری اوصاف نہیں ہیں تو اس اجمال کی تفصیل اگلے ابوب میں سامنے آ رہی ہے۔

# باب:2

## ڈاکٹر اسرار صاحب قرآن کے خلاف
## اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان کو شرط نہیں مانتے

''حقیقت و ماہیت ایمان'' کے عنوان سے ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک آڈیو کیسٹ دستیاب ہے۔اس میں وہ فرماتے ہیں:

''قانونی مومن (یعنی جس نے زبان سے کلمہ پڑھ لیا ہو اس) کی باطنی اعتبار سے تین کیفیتیں ہیں:

1- دل میں مثبت طور پر ایمان ہو۔اس کو وہ حقیقی ایمان اور Plus Value سے تعبیر کرتے ہیں۔

2- پہلی کے برعکس یعنی دل میں کفر ہو۔ یہ منافق ہے اور اس کو وہ Minus Value سے تعبیر کرتے ہیں۔

3- ان دونوں کے بین بین Zero Value ہے کہ نہ دل میں مثبت طور پر ایمان ہو اور نہ منفی طور پر نفاق ہو بلکہ ایک خلا کی کیفیت ہے اندر کچھ بھی نہیں۔ہم میں سے اکثر کا حال یہی ہے۔ یہ پونجی وراثت میں ملی ہے لیکن دلوں کو ٹٹولیں تو یقین قلبی والا ایمان نہیں الا ماشاءاللہ۔

اس کی دلیل سورہ حجرات کی یہ آیت ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔(سورہ حجرات:14)

﴿بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن تم یوں کہو کہ ہم فرمانبردار ہوئے اور ابھی تک داخل نہیں ہوا ایمان تمہارے دلوں میں﴾۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ یہ منافقین کا ذکر ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور یہ مغالطہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ پھر تو یہ منافق ہوئے کہ ظاہر میں اسلام ہے اور دل میں ایمان نہیں کیونکہ آگے اعمال کے قبول ہونے کا فرمان ہے۔

**وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰه وَرَسُوْلَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا** (سورہ حجرات:14)

﴿اور اگر تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی تو نہیں کمی کرے گا تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی﴾۔

جب کہ منافق کا تو کوئی بھی عمل مقبول نہیں۔اگر چہ قانون تو یہی بنتا ہے کہ اگر ایمان نہیں تو اطاعت مقبول نہ ہو لیکن اللہ اپنی شان غفاری ورحیمی کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں''۔(حقیقت و ماہیت ایمان نمبر 4)

اپنے اسی دعوے کی تائید میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے رسالہ میثاق شمارہ دسمبر 1990ء میں ''ایمان اور اسلام کا فرق اور قانونی مسلمان کی باطنی اعتبار سے تین ممکن حالتیں کے عنوان کے تحت علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب الایمان کی ایک فصل کے ابتدائی کچھ حصے کا ترجمہ بھی شائع کیا۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ دین اسلام اور قرآن کا قانون یہی ہے کہ ایمان کے بغیر اطاعت قبول نہیں کیونکہ قرآن پاک میں ہے۔

**وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ** (سورہ انبیاء:94)

﴿اور جو کوئی نیک عمل کرے درانحالیکہ وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی﴾۔

لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کا دعوی ہے کہ قرآن نے اپنے قانون کو خود ہی توڑ دیا ہے اور پھر اس دعوے کی دلیل محض ڈاکٹر صاحب کی کج فہمی یا غلط فہمی ہے کیونکہ سورہ حجرات کی مذکورہ بالا آیت سے جو بات ڈاکٹر اسرار صاحب نے سمجھی ہے وہ کسی بھی مفسر کو سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی علامہ ابن تیمیہ نے سمجھی بلکہ خود ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اصل بات ڈاکٹر صاحب کی کج فہمی کا مظلوم شکار بن کر رہ گئی۔

سورہ حجرات میں مذکوراعراب سے کون لوگ مراد ہیں؟ اکثر حضرات کی رائے ہے کہ یہ منافق لوگ تھے کہ ان کو ایمان سرے سے حاصل ہی نہ تھا اوران کو جو یہ کہا گیا کہ اگر تم اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کروتو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ اوران کے دیگر احکامات کو پورا کرو۔ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ یہ اعراب مسلمان تھے اوران کو ایمان بھی حاصل تھا لیکن وہ اتنا کمزور تھا کہ ان کے لئے ایمان کا دعوی کرنا برمحل نہ تھا۔

تفسیر بیضاوی میں ہے:

**﴿قالت الاعراب آمنا﴾۔ نزلت فی نفر من بنی اسد قدموا المدینة فی سنة جدبة واظهروا الشهادتين و كانوا يقولون لرسول الله ﷺ اتيناک بالاثقال و العيال ولم نقاتلک كما قاتلک بنو فلان يريدون الصدقة و يمنون ﴿قل لم تومنوا﴾ اذ الايمان تصديق مع ثقة و طمانينة قلب و لم يحصل لكم والا لما مننتم على الرسول عليه الصلوة والسلام بالاسلام و ترک المقاتلة كما دل عليه آخر السورة ﴿ولكن قولوا اسلمنا﴾ فان الاسلام انقياد و دخول فی السلم واظهار الشهادتين و ترک المحاربة۔ ﴿وان تطيعوا الله و رسوله ......﴾ بالاخلاص و ترک النفاق ﴿لا يلتكم من اعمالكم﴾ لا ينقصكم من اجورها ﴿شيئا﴾ ﴿ان الله غفور﴾ لما فرط من المطيعين ﴿رحيم﴾ بالتفضل عليهم۔**

یہ آیت بنو اسد کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جو قحط کے سال مدینہ منورہ آئے کلمہ کا اقرار کیا اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ ہم آپ کے پاس بوجھ اور عیال لے کر آئے ہیں اور ہم نے آپ سے لڑائی نہیں کی جیسا کہ فلاں قبیلے والوں نے آپ سے لڑائی کی تھی۔ان کا مقصد صدقہ حاصل کرنا تھا اور احسان رکھتے تھے ( آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے ) کیونکہ ایمان تو دل کی پختگی اور اطمینان کے ساتھ تصدیق کرنے کو کہتے ہیں اور یہ تمہیں ابھی تک حاصل نہیں ہوئی ورنہ تم رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور ترک قتال کا احسان نہ رکھتے جیسا کہ اس پر سورت کا آخری حصہ دلالت کرتا ہے اور لیکن یہ کہو کہ ہم مطیع ہو گئے )۔

کیونکہ اسلام اطاعت گزاری اور سلامتی میں داخل ہونے اور کلمہ شہادت کے اظہار اور ترک قتال کو کہتے ہیں ( اور اگر تم

اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کرو) اخلاص اورترک نفاق کے ساتھ (نہیں کم کرے گا تمہارے اعمال میں سے) نہیں کم کرے گا ان کے اجر میں سے (کچھ) بلاشبہ اللہ بخشنے والے ہیں اس کو جو اطاعت گزاروں سے کوتاہی ہوئی (رحم کرنے والے ہیں)۔ان پر مہربانی فرما کر۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''**وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ** '' کا مطلب ہے کہ اگر تم اخلاص کے ساتھ اورنفاق کو چھوڑ کراس کے رسول کی اطاعت کروگے تو اللہ تمہارے اعمال کے اجر میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔علامہ بیضاوی کے نزدیک اگران میں نفاق نہ تھا تو پھروہ یہ کیوں کہتے کہ نفاق کو چھوڑ کر اطاعت اختیار کرو۔

2- روح المعانی میں ہے۔

**قال المجاهد نزلت فی بنی اسد بن خزيمة قبيلة تجاورالمدينة اظهروا الاسلام و قلوبهم دغلة انما يحبون المغانم و عرض الدنيا (وان تطيعوا الله و رسوله) بالاخلاص و ترک النفاق۔**

صحابہ کے شاگرد مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قبیلہ بنو اسد کے بارے میں نازل ہوئی جو مدینہ میں رہنے لگا تھا اور قبیلہ والوں نے اسلام کا اظہار کیا حالانکہ ان کے دلوں میں کھوٹ تھا۔ان کی غرض تو مال غنیمت اور دنیوی ساز وسامان تھا فرمایا اگر تم اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کرو اخلاص کے ساتھ اورترک نفاق کے ساتھ۔

3- تفسیر نسفی میں ہے **(وان تطيعوا الله و رسوله) فی السربترک النفاق۔**

﴿اگر تم اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت کرو﴾ چھپی حالت میں نفاق کو ترک کر کے۔

4- تفسیر ابن عباس میں ہے۔

**نزلت هذه الاية فی بنی اسد اصابتهم سنة شديدة فدخلوا فی الاسلام متوافرين باهاليهم و ذراريهم و جاء وا الی النبی ﷺ بالمدينة ...... وكانوا منافقين يقولون اطعمنا و اكرمنا يا رسول الله فانا مخلصون مصدقون**

**فی ایماننا و کانوا منافقین فی دینھم کا ذبین فی قولھم فذکر اللہ مقالتھم فقال۔**

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بنو اسد کے قبیلہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ سخت قحط میں مبتلا ہوئے تو اپنے اہل عیال سمیت کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے اور نبی ﷺ کے پاس مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے ......اور یہ لوگ منافق تھے اور یوں کہتے تھے کہ اے اللہ کے رسول ہمیں اناج بھی دیجئے اور ہمارا اکرام بھی کیجئے کیونکہ ہم مخلص ہیں اور اپنے ایمان میں سچے ہیں حالانکہ وہ اپنے دین میں منافق تھے اور اپنی بات میں جھوٹے تھے تو اللہ تعالی نے ان کی بات ذکر کر کے فرمایا۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

**وانما قلنا ھذا لان البخاری رحمہ اللہ ذھب الی ان ھؤلاء کانوا منافقین یظھرون الایمان و لیسوا کذلک۔**

''ہم نے یہ بات اس لئے کہی ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ یہ لوگ منافق تھے جو ایمان کا اظہار کرتے تھے حالانکہ مومن نہ تھے (بلکہ منافق تھے)۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔'' یہ (بعضے) گنوار (بنی اسد وغیرہ کے آپ کے پاس آ کر جو ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ اس میں کئی امر بدیع کے مرتکب ہوتے ہیں ایک تو کذب کہ بلا تصدیق قلب محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ وہ موقوف ہے تصدیق قلبی پر اور وہ منفی ہے جیسا عنقریب آتا ہے **ولما یدخل الایمان**) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت بمعنی ترک مخالفت محض ظاہری موافقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے، اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (گو اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ بعد ایمان کے ہوں گے محض اس وقت کے کفر و کذب کی وجہ سے جو اس وقت کے اعتبار سے گذشتہ ہوگا) ذرا بھی کم نہ کرے گا''۔

صحابہؓ اور تابعینؒ اور امام بخاریؒ اور ان کے علاوہ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اعراب منافق تھے لیکن ڈاکٹر اسرار صاحب کا ادعائے قرآن فہمی دیکھئے کہ سب کو غلط کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ یہ منافقین کا ذکر ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے'' اور اپنے دعوے پر وہ دلیل لائے ہیں جو قرآن، حدیث اور تفسیر کے خلاف ہے اور اس حدیث کا مصداق ہے۔

**من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعده من النار**

جوشخص قرآن کے بارے میں (ضروری) علم کے بغیر کچھ کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ لوگ منافق نہ تھے بلکہ بہت کمزور ایمان والے تھے اور ان کو اگرچہ نفس تصدیق تو حاصل ہو چکی تھی لیکن اس میں قوت اور چمک نہیں آئی تھی۔

1- تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

**فدل هذا ان هولاء الاعراب المذكورين فى هذه الاية ليسوا بمنافقين و انما هم مسلمون لم يستحكم الايمان فى قلوبهم فادعوا لانفسهم مقاما اعلىٰ مما و صلوا اليه فاد بوا فى ذلك و هذا معنى قول ابن عباس رضى الله عنهما و ابراهيم النخعى وقتادة و اختاره ابن جرير۔**

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں مذکور اعراب منافق نہ تھے بلکہ مسلمان تھے ایمان ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا تو انہوں نے اپنے لئے ایسے مقام کا دعویٰ کیا جو ابھی ان کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا اس پر تادیب کی گئی۔ یہ ابن عباس، ابراہیم نخعی اور قتادہ کے قول کا معنی ہے اور اس کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔

تفسیر کبیر میں امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

**ويحتمل ان يقال بان الاية فيها اشارة الى حال المؤلفة اذا اسلموا و يكون ايمانهم بعد ضعيفا۔ قال لهم لم تومنوالان الايمان ايقان و ذلك بعد لم يدخل فى قلوبكم و سيدخل باطلاعكم على محاسن الاسلام۔**

(ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت میں مؤلفہ القلوب کی طرف اشارہ ہے جب کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور ان کا ایمان ابھی تک کمزور ہو تو ان سے کہا کہ تم ایمان نہیں لائے کیونکہ ایمان تو یقین (کی رونق) کو کہتے ہیں جو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور محاسن اسلام کو معلوم کر کے حاصل ہوگا۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس دوسری رائے کو اختیار کیا ہے جس کی تائید ان کی کتاب الایمان کی اس عبارت سے ہوتی ہے۔
''اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے اسلام کے کچھ محاسن آتے ہیں جو اس کے اسلام قبول کرنے کے لئے داعی بنتے ہیں (یاد رہے کہ دین وشریعت کی اصطلاح میں ایمان واسلام کا ایک ہی معنی ہے۔ ناقل) اور یہ بھی صورت ہوتی ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور ان میں پرورش پاتا ہے تو اسلام کے کچھ محاسن اور کفر کی کچھ برائیوں سے مطلع ہونے کے باعث اس کو اسلام سے محبت ہوتی ہے۔

لیکن اس قسم کے بہت سے لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب وہ اسلام پر کئے گئے اعتراضات سنتے ہیں تو شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ لوگ اس زمرے میں شامل نہیں ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ **اِنَّمَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔** (سورہ حجرات:15)
﴿ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ پھر شبہ نہ کریں اور لڑیں اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے اور نہ ہی باطنی اعتبار سے یہ منافق ہوتے ہیں کہ دل میں کفر کو چھپائے ہوئے ہوں﴾۔

لہٰذا ایسے لوگ نہ تو پکے وحقیقی مومن ہوتے ہیں اور نہ ہی منافق ہوتے ہیں اور نہ ہی مرتکب کبائر ہوتے ہیں بلکہ ظاہری طاعات تو کرتے ہیں البتہ ایمان کے جو حقائق پکے وحقیقی مومن کو حاصل ہوتے ہیں ان سے یہ محروم ہوتے ہیں۔ پس ان کے پاس ایمان تو ہے لیکن یہ پکے وحقیقی مومن نہیں اور یہ جو نیکیاں کرتے ہیں ان پر یہ اجر پاتے ہیں اسی لئے ارشاد فرمایا **وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا** اور اسی لئے فرمایا:

**يَـمُـنُّـوْنَ عَـلَيْكَ أَنْ أَسْـلَـمُـوْا قُـلْ لَا تَـمُنُّوْا عَلَىَّ اسْلَامَكَمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْايْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔** (سورہ حجرات:17)

﴿ یہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے۔ آپ کہہ دیجئے مجھ پر احسان نہ رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو راہ دی ایمان کی اگر تم (اپنے اس قول میں کہ ہم ایمان لائے) سچے ہو ﴾۔

فرمایا اگر تم (اپنے ایمان کے دعوے میں) سچے ہو تو اللہ نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ایمان کی راہ دکھائی۔ یہ ارشاد اس حقیقت کا مقتضی ہے وہ اپنے قول اٰمَنَّا میں سچے تھے۔ البتہ ان کی سچائی:

1- یا تو اس معنی میں تھی کہ وہ **اٰمَـنُـوْا بِـالـلّٰـهِ وَرَسُـوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰـئِكَ هُـمُ الصَّادِقُوْنَ** یعنی ﴿ جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر انہوں نے شک نہیں کیا اور جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں وہی لوگ سچے ہیں ﴾۔

2- یا اس معنی میں تھی کہ وہ منافقین کی مانند نہ تھے بلکہ صاحب ایمان تھے اگرچہ ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ (کمزور ایمان کے ہوتے ہوئے) وہ مطلق ایمان کا دعوی کریں (جس سے کامل ایمان سمجھ میں آتا ہے کیونکہ کمزور ایمان تو مسلم و مومن کی شایان شان ہی نہیں وہ بھی خصوصاً دور نبوی میں)

یہ دوسرا معنی ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ...... اللہ تعالیٰ نے (قرآن پاک میں دعوائے ایمان کرنے والوں میں سے) صرف منافقین کو جھوٹا کہا کسی اور کو نہیں کہا۔ اور اعراب کو بھی جھوٹا نہیں کہا بلکہ یوں فرمایا لم تومنوا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے **لايـومـن احـدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه** (تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے) اور **لايـومـن من لا يامن جاره بوائقه** (وہ شخص مومن نہیں جس کا پڑوسی اس کے ایذاءرسانیوں سے امن میں نہ ہو)۔

جب کہ یہ حدیثیں منافقین کے بارے میں نہیں ہیں اور آیت کا سیاق اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اس وجہ سے کی کہ انہوں نے اپنی جہالت واجڈ پنے کی بناء پر اسلام کا احسان جتلایا اور مافی القلب کا اظہار کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کو تو اس کا علم تھا کیونکہ ارشاد فرمایا:

**قُلْ أَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰه بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ**

﴿ آپ کہئے کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنی دینداری حالانکہ اللہ کو تو خبر ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں ﴾۔

اگر ان کے دل میں کچھ بھی دین (وایمان) نہ ہوتا تو وہ اللہ کو اپنے دین کے بارے میں نہ جتلاتے کیونکہ ظاہری اسلام کو تو ہر کوئی پہچان لیتا ہے''۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی یہ پوری عبارت پڑھ کر ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی ذرا بھی یہ خیال کرے گا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک اعراب کی باطنی حالت Zero Value کی تھی بلکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تو بار بار ان کے ایمان کا برملا اظہار کر رہے ہیں جیسا کہ خط کشیدہ مقامات سے ظاہر ہے اگرچہ اتنی بات ہے کہ ان میں موجود ایمان کمزور اور ناقص درجے کا تھا اعلیٰ درجہ کا نہیں تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی کمزور و ناقص کیوں نہ ہو مثبت طور پر موجود تو ہے لہٰذا یہ Plus Value ہے۔ اس کو Zero Value کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

# باب:3

## ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف قول کہ حقیقی ایمان کے دو رکن ہیں۔تصدیق و یقین اور جہاد

ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ حقیقی ایمان کے دو رکن ہیں۔تصدیق و یقین اور جہاد۔اور حقیقی ایمان کے بارے میں ان ہی کا کہنا ہے کہ یہ وہ ایمان ہے کہ جو آخرت میں معتبر ہوگا۔نیز یہ کہ مثبت جانب یقین پایا جائے تو ایمان ثابت ہوگا۔اس کو وہ Plus value سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر اس مثبت کیفیت میں تفاوت کے قائل ہیں جس کی بنا پر اگر مثبت اکائی کا عشر عشیر بھی ہو تو ایمان ثابت ہو جانا چاہیئے۔بس قلب خالی نہ ہونا چاہیئے اور نہ ہی منفی کیفیت ہونی چاہیئے جو کہ نفاق ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب ان دونوں ارکان کے باہمی تلازم کے اس حد تک قائل ہیں کہ کہتے ہیں کہ اگر جہاد (اپنے وسیع ترین معنوں میں) ہے تو ایمان ہے اور جہاد نہیں تو ایمان نہیں، لیکن وہ حقیقی ایمان جو عبارت ہے یقین قلبی سے لازماً عمل میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔حتیٰ کہ اگر عمل میں تبدیلی نہ پیدا ہو تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ حقیقی ایمان موجود نہیں (راہ نجات ص33)

لیکن جب یہی ایمان تصدیق بالقلب کے درجے کو پہنچ جاتا ہے یعنی یقین بن کر دل میں اتر جاتا ہے تو پھر عمل کا بدل جانا لازمی ہے (راہ نجات 24)

**واللّٰہ لا یومن واللّٰہ لا یومن و اللّٰہ لا یومن قالوا من یا رسول اللہ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ** ۔غور فرمائیے کہ آنحضور ﷺ کس قدر تاکید کے ساتھ ایمان کی نفی کلی کا اعلان فرما رہے ہیں ...... کیا اس کے بعد بھی اس

خیال کی گنجائش ہے کہ ایمان اور عمل دو علیحدہ چیزیں ہیں اور باہم لازم وملزوم نہیں (راہ نجات 24)

''اس لئے کہ انسان کا عملی رویہ اس کے یقین ہی پر مبنی ہوتا ہے جیسے ہمیں یقین ہے کہ آگ جلا دیتی ہے تو ہم آگ میں ایک انگلی تک ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ یقین تو دور کی بات ہے انسان کا عمل تو گمان سے بھی متاثر ہو جاتا ہے جیسے ہمیں معلوم ہے کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن اگر گمان سا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ سانپ زہریلا ہو تو اس گمان کے نتیجہ میں ہم لازماً اس سے بچتے ہیں'' (راہ نجات 25-24)

''...... پھر اگر کسی شخص کو یقین ہو کہ خدا ہے اور وہ سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہے...... تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے عمل میں تبدیلی پیدا نہ ہو اور وہ گناہ اور معصیت کی زندگی بسر کرتا رہے، یہی امر ہے جو حضور ﷺ کے اس قول مبارک میں بیان ہوا ہے کہ لا یزنی زانٍ حین یزنی و ہو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق و ہو مومن ولا یشرب الخمر حین یشرب و ہو مومن ...... بلکہ ان گناہوں کا صدور ہوتا ہی اس وقت ہے جب کسی سبب سے حقیقی ایمان دل سے زائل ہو جاتا ہے۔ گویا ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں باہم لازم وملزوم ہیں بلکہ صحیح اور درست عمل اور عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار ایمان حقیقی کا لازمی جزو ہیں''۔ (راہ نجات: ص25)

راقم کا موقف یہ ہے کہ ''میں اس دنیا میں کسی کے دعوی اسلام و ایمان کی قبولیت کا دار و مدار صرف اس کے قول کو قرار دیتا ہوں عمل کی بنیاد پر کسی کے دعویٰ اسلام کو رد کر دینا درست نہیں سمجھتا۔ چنانچہ میرے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ تکفیر کی صرف ایک صورت درست ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام کی کسی بنیادی بات (جیسے مثلاً ختم نبوت) کا انکار کرے یا اس کی ایسی تعبیر کرے جو انکار کو مستلزم ہو، رہا آخرت کا معاملہ تو وہ اللہ کے حوالہ ہے، وہ علیم بذات الصدور ہے۔ چنانچہ اپنے علم کامل کی اساس پر فیصلہ کرے گا۔ البتہ اصولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف وہی ایمان معتبر ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں تصدیق بالقلب یعنی دلی یقین کے ساتھ ہو اور اس مرتبہ پر اعمال صالحہ

بھی ایمان کے ذیل میں آجاتے ہیں (ص 27 میثاق ۔ مارچ 1985ء)

ہم کہتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے یہاں جو عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ ایک بدعتی فرقہ معتزلہ کا ہے ۔ اہلسنت کا عقیدہ اس سے بہت مختلف ہے ۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ جن کو ڈاکٹر اسرار صاحب گذشتہ صدی کا مجدد مانتے ہیں وہ فرماتے ہیں:
''مصداق ایمان میں اعمال کو داخل کرنے میں تین مذہب ہیں، ایک یہ کہ اعمال حقیقت ایمان شرعی کے لئے جز حقیقی ہیں ۔ اور واذا فات الجزء فات الکل ۔ دوسرے یہ کہ اعمال ایمان سے بالکل خارج ہیں حتیٰ کہ مصداق ایمان سے بھی بے تعلق ہیں ۔ بلکہ الایمان قول بلا عمل ان کا مقولہ ہے ۔ تیسرے یہ کہ حقیقت ایمانی سے خارج ہیں مگر کمال انسانی کے لئے موقوف علیہ ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ اعمال حقیقت ایمانی سے خارج ہیں مگر کمال انسانی کے لئے موقوف علیہ ہیں ۔

خلاصہ یہ کہ اعمال حقیقت ایمانی سے تو خارج ہیں مگر کمال ایمانی کے جزو ہیں اور اس میں داخل ہیں ۔ یہ تیسرا مذہب اہل سنت کا ہے ۔ اور پہلا خوارج و معتزلہ کا ہے اور دوسرا مرجئہ کا ۔ اور اہل سنت میں جو اس مسئلہ میں خلاف منقول ہے اس کے لفظی ہونے میں وہی شک کرسکتا ہے جو الفاظ سے معانی تلک نہیں پہنچ سکتا کما صرح بہ علماء الفریقین'' (الابواب والتراجم)

مسایرہ (جس کی شرح مسامرہ ہے اس) میں ہے ۔
**فقیل هو ‹ای الایمان› التصدیق بالقلب فقط و هو مختار جمهورالا شاعرة او مع الطاعة و هو قول الخوارج ولذا کفروا بالذنب لانتفاء جزء الماهیة او باللسان فقط و هو قول الکرامیه فان طابق تصدیق فهومومن ناج والاهومومن مخلد فی النار او بالقلب و اللسان و هو منقول عن ابی حنیفة و مشهور عن اصحابه و بعض المحققین من الاشاعرة۔** (ص 33 مسامرہ شرح مسایرہ مصری)

( کہا گیا ہے کہ ایمان فقط تصدیق قلبی کا نام ہے یہ جمہور اشاعرہ کا مختار مذہب ہے یا طاعت کے ساتھ ہے یہ خوارج کا قول ہے۔اسی بنا پر وہ گناہ پر تکفیر کرتے ہیں کیونکہ اس میں ماہیت ایمان کے ایک جزو کا انتفاء ہے یا ایمان فقط زبان سے ہے یہ کرامیہ کا قول ہے۔ پھر اگر تصدیق قلبی بھی ہو تو وہ شخص ناجی مومن ہے ورنہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والا مومن ہے۔ یا ایمان دل وزبان کے ساتھ ہے یہ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے اور ان کے اصحاب اور بعض محققین اشاعرہ کا مشہور مذہب ہے)۔

مذکورہ بالا حوالجات سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ تصدیق قلبی اور عمل دونوں ہی کو ایمان کے رکن اس طرح سے قرار دینا کہ اگر عمل نہ رہے تو ایمان بھی نہ رہے یہ اہلسنت کا عقیدہ نہیں بلکہ معتزلہ اور خوارج کا عقیدہ ہے۔اسی بات کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں یوں لکھتے ہیں:

**والکلام ھھنا فی مقامین۔ احدھما کونہ قولا و عملا و الثانی کو نہ یزید و ینقص فاما القول فالمراد بہ النطق بالشھادتین و اما العمل فالمراد بہ ما ھوا عم من عمل القلب والجوارح لید خل الاعتقاد والعبادات و مراد من ادخل ذلک فی تعریف الایمان و من نفاہ انما ھو بالنظر الیٰ ماعند اللہ تعالیٰ فالسلف قالوا ھوا عتقاد القلب و نطق باللسان و عمل بالا رکان و ارادوا بذلک ان الاعمال شرط فی کمالہ و من ھنا نشأ لھم القول بالزیادۃ والنقص کما سیأتی والمرجئۃ قالوا ھو اعتقاد و نطق فقط۔ والکرامیہ قالوا ھو نطق فقط۔ والمعتزلۃ قالوا ھو العمل والنطق والاعتقاد و الفارق بینھم و بین السلف انھم جعلوا الاعمال شرطا فی صحتہ و السلف جعلوھا شرطا فی کمالہ و ھذا کلہ کما قلنا بالنظر الی ماعند اللّٰہ تعالیٰ اما بالنظر الیٰ ما عندنا فالایمان ھوا لا قرار فقط فمن اقر اجریت علیہ الاحکام فی الدین ولم یحکم علیہ بکفر الا ان اقترن بہ فعل یدل علی کفرہ کالسجود للصنم۔**

یہاں گفتگو دو باتوں میں ہے ایک ایمان کے قول وعمل ہونے میں دوسرے اس کے کم وبش ہونے میں۔ جہاں تک قول کا تعلق ہے تو اس سے مراد شہادتین کو زبان سے ادا کرنا ہے، رہا عمل تو اس سے مراد عام ہے خواہ عمل قلب ہو یا عمل جوارح تا کہ اعتقاد اور عبادات داخل ہو جائیں۔ جن لوگوں نے اس کو ایمان کی تعریف میں داخل کیا اور جنہوں نے اس کی نفی

کی تو یہ محض اللہ تعالیٰ کے ہاں کے اعتبار سے کی، اسلاف نے کہا کہ ایمان قلبی اعتقاد، زبانی گواہی اور عمل جوارح کا نام ہے اور اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ کمال ایمان کے لئے اعمال شرط ہیں۔ یہیں سے ان کے ایمان کے کم وبیش ہونے کا قول نکلا۔

مرجئہ نے کہا کہ ایمان صرف اعتقاد و اقرار کا نام ہے۔ کرامیہ نے کہا کہ یہ فقط اقرار کا نام ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ یہ عمل، اقرار اور اعتقاد کے مجموعے کا نام ہے۔ ان کے اور اسلاف کے درمیان فرق یہ ہے کہ انہوں نے اعمال کو ایمان کی صحت کی شرط بنایا ہے جب کہ اسلاف نے اس کو ایمان کے کمال کی شرط بتلایا ہے، یہ سب کچھ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں کے اعتبار سے ہے جہاں تک ہمارے اعتبار کا تعلق ہے تو ایمان فقط اقرار کو کہتے ہیں۔ جس شخص نے اقرار کرلیا اس پر دنیا میں احکام جاری کئے جائیں گے اور اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا الا یہ کہ اقرار کے ساتھ کوئی ایسا فعل بھی پایا جا رہا ہو جو کفر پر دلالت کرتا ہو جیسے بت کو سجدہ کرنا۔

اہلسنت کے تمام حضرات کا عقیدہ مزید وضاحت کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کا نظریہ ان سب سے الگ ہے۔ شرح عقائد نسفی کی شرح نبراس میں ہے۔

**ان لا هل القبلة فی الایمان مذاهب الاول انه التصديق و هو مذهب الشيخ ابی الحسن الاشعری والا مام ابی منصور الماتريدی و فخر الدين الرازی والقاضی البيضاوی و مختار الشارح و جمهور المحققين و الاقرار عندهم شرط لا جراء الاحكام الثانی انه التصديق والا قرار و هو مذهب جمهورالفقهاء و مختار المصنف و امامنا الاعظم ابی حنيفة رحمه الله۔..................**

**السادس انه التصديق والا قرار والعمل بحيث لا يكون ترک الطاعة مخرجا عن الايمان و هو مذهب اكثر السلف و منهم مالک و الشافعی و احمد رحمهم الله۔** (شرح نبراس ص399 مطبوعہ بندیال سرگودھا)

(اہل قبلہ یعنی مسلمانوں کے ایمان کے بارے میں چند مذاہب ہیں۔ اول یہ ہے کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے یہ شیخ ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، فخر الدین رازی، قاضی بیضاوی علامہ تفتازانی اور جمہور محققین کا مذہب ہے اور

اقرار ان کے نزدیک (ان پر مسلمانوں کے) احکام جاری کرنے کے لئے شرط ہے۔ دوم ایمان تصدیق و اقرار کے مجموعے کا نام ہے یہ جمہور فقہاء علامہ نسفی اور ہمارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

ششم ایمان تصدیق و اقرار اور عمل کے مجموعے کا نام ہے اس طور پر کہ طاعت کے ترک سے ایمان سے نہیں نکلتا یہ اکثر اسلاف کا مذہب ہے جن میں امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ شامل ہیں)۔

اہلسنت میں سے جن حضرات نے عمل کو رکن بتایا ہے انہوں نے اس کو کمال ایمان کا رکن یا اس کی شرط بتایا ہے۔ یہ بات اوپر کے حوالجات سے بھی معلوم ہوئی اور آگے مزید وضاحت سے مذکور ہے۔

علامہ عبدالعزیز پرہاروی لکھتے ہیں:

**ولا يخفىٰ ان هذه الوجوه الاربعة انما تقوم حجة على من يجعل الطاعات ركنا من حقيقة الايمان بحيث ان تاركها لايكون مومنا ضرورة انتفاء الكل بانتفاء الجزء كما هو رأى المعتزلة و الخوارج لا على من ذهب الٰى انها ركن من الايمان الكامل و هو الذى يكون صاحبه غير مستحق للعذاب بحيث لا يخرج تاركها عن حقيقة الايمان و هو الذى يكون صاحبه ناجيا عن العذاب الابدى كما هو مذهب الشافعى رحمه الله و اهل الحديث و تحقيق هذا المقام ان السلف و اهل الحديث جعلوا العمل جزء الايمان ...... لكن هولاء صرحوا بان تارک العمل مومن و هذا مشكل لان انتفاء الجزء يستلزم انتفاء الكل وكان البخارى صاحب الصحيح يبالغ فى ان العمل من الايمان حتىٰ قال كتبت الحديث عن الف و ثمانين نفساولم اكتب الا عمن قال الايمان قول و عمل و مع ذلک قال فى قوله عليه الصلوة والسلامً لايزنى الزانى حين يزنى و هو مؤمن"۔ لا يكون هذا مومنا تاما ولا يكون له نوراالايمان انتهٰى۔ وللعلماء فى توجيه كلامهم وجهان الاول ما اختاره الشارح فى مصنفاته و هو ان الايمان يطلق علىٰ ماهو اساس النجاة عن العذاب المخلد و هو التصديق وحده اومع الاقرار و على الكامل المنجى عن كل عذاب و هو التصديق والا قرار و العمل فالاول مقابل الكفر و الثانى مقابل العصيان الثانى ما اختاره العلامة جلال الدين الدوانى و هوان المعتزلة جعلوا الاعمال جزءا من حقيقة الايمان داخلة فى قوامه فيلزم من عدمها عدمه۔ اما السلف فجعلوها جزء عرفية لايلزم من عدمها عدمه كالشعر و الظفر واليد والرجل للانسان وكالاوراق والا غصان للشجرة ولا يلزم من انعدام هذه الاجزاء**

**انعدام الانسان و الشجرة۔ فلفظ الایمان عندهم موضوع للقدر المشترک بین التصدیق و بینه وبین الاعمال کما ان المعتبر فی الشجرة المعینة فی العرف هوالقدر المشترک بین ساقها و مجموع ساقها مع الشعب والاوراق فلایحکم بانعدام الایمان مابقی التصدیق کما لا یحکم بانعدام الشجرة ما بقی ساقها**
(شرح نبراس ص 401)

(مخفی نہیں ہے کہ یہ چار وجوہ اس شخص کے خلاف دلیل ہیں جو طاعات کو ایمان کی حقیقت کا رکن شمار کرتا ہے۔ اس طور پر کہ ان کا تارک مومن نہیں اس بناء پر کہ یہ بات ضروری ہے کہ جزء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہوتا ہے جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے، اس شخص کے خلاف دلیل نہیں جس کا مذہب یہ ہے کہ طاعات ایمان کامل کا رکن ہے اور ایمان کامل وہ ہے جس کا مالک عذاب کا مستحق نہیں ہوتا اس طور پر کہ طاعات کا تارک حقیقت ایمان سے نہیں نکلتا اور حقیقت ایمان وہ ہے کہ جس کا صاحب ابدی عذاب سے نجات پا تا ہے جیسا کہ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل حدیث کا مذہب ہے۔ اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ اسلاف اور محدثین نے عمل کو ایمان کا جزء قرار دیا ہے......لیکن ان لوگوں نے تصریح کر دی کہ تارک عمل مومن ہوتا ہے۔

اس پر اشکال ہے کیونکہ جزء کا انتفاء کل کے انتفاء کو مستلزم ہے نیز امام بخاری رحمہ اللہ خوب زور دیتے ہیں کہ عمل ایمان میں سے ہے یہاں تک کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار اسی اشخاص سے حدیث لکھی اور وہ سب یہی کہتے تھے کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ نبی ﷺ کے ارشاد لا یزنی الزانی حین یزنی وہو مومن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ مومن تام نہیں ہوگا اور اس کے لئے نور ایمان نہیں ہوگا الخ۔

ان کے کلام کی توجیہ میں علماء نے دو وجہیں بیان کی ہیں اول وہ جس کو شارح نے اپنی تصنیفات میں اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ ایمان کا اطلاق عذاب خلد سے نجات کی اساس پر کیا جاتا ہے اور یہ اساس تنہا تصدیق ہے یا مع اقرار ہے، اور اس ایمان پر بھی کیا جاتا ہے جو کامل ہو اور ہر عذاب سے نجات دینے والا ہو یہ تصدیق واقرار وعمل کا نام ہے، پس اول کفر کا مقابل اور ثانی نافرمانی کا مقابل ہے، ثانی توجیہ وہ ہے جس کو علام جلال الدین دوانی نے اختیار کیا ہے اور وہ یہ کہ معتزلہ نے اعمال کو حقیقت ایمان کا جزء اور اس کے قوام میں داخل مانا لہذا اعمال کے عدم سے ایمان کا عدم لازم آیا۔

رہے اسلاف تو انہوں نے اعمال کو جزءعرفی قرار دیا ہے جس کے عدم سے ایمان کا عدم لازم نہیں آتا۔ مثل بال، ناخن، ہاتھ اور پاؤں انسان کے لئے۔ اور پتے اور ٹہنیاں درخت کے لئے۔ ان اجزاء کے انعدام سے انسان و درخت کا انعدام لازم نہیں آتا پس ان کے نزدیک ایمان کا لفظ تصدیق اور تصدیق و اعمال کے مابین قدر مشترک کے لئے وضع کیا گیا ہے جیسا کہ معین درخت میں عرف ورواج میں اعتبار اس قدر مشترک کا ہے جو اس کے تنے اور اس کے تنے وٹہنیوں و پتوں کے مجموعے کے مابین ہے لہٰذا ایمان کے انعدام کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جائے گا جب تک کہ تصدیق باقی ہے جیسا کہ درخت کے انعدام کا حکم نہیں لگایا جاتا جب تک کہ تنا باقی ہو)۔

## ڈاکٹر اسرار صاحب کے تصدیق قلبی اور عمل کے مابین تلازم پر استدلال کا جواب

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

**التصديق هو الاذعان عندالحكماء و هو اما ادراک او من لواحق الادراک والحق عندی هو الثانی ثم التصديق قد يجتمع مع الجحود ايضا و هو كفر قطعاً قال تعالٰی "وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما و علوا" و قال تعالیٰ ايضاً۔ يعرفونه كما يعرفون ابناء هم" وقال تعالیٰ "فلما جاء هم ماعرفوا كفروا به"۔**

**فانظر كيف اجتمع اليقين والا دغان۔ و المعرفة مع الجحود۔**

**وهذا هرقل عظيم الروم يقول لوأني اعلم انی اخلص اليه لتجشمت لقاء ه ولو كنت عنده لغسلت عن قدميه۔ و فی فتح البارى عن مرسل ابن اسحق عن بعض اهل العلم ان هرقل قال ويحک والله انی لاعلم انه نبی مرسل ولكنی اخاف الروم علی نفسی ولولا ذلک لا تبعته۔**

(حکماء کے نزدیک تصدیق اذعان کو کہتے ہیں اور یہ یا تو ادراک ہے یا لواحق ادراک میں سے ہے اور میرے نزدیک دوسری بات ہی حق ہے پھر تصدیق کبھی انکار کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے اور یہ قطعی کفر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے اور انہوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ ان کے نفس اس پر یقین رکھتے تھے ظلم اور تکبر کی وجہ سے۔ نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے وہ آپ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ نیز ارشاد ہے جب ان کے پاس وہ چیز آئی جس کو وہ پہچانتے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ دیکھو کیسے اذعان ویقین ومعرفت کا اجتماع انکار کے ساتھ ہو گیا۔

ہرقل عظیم روم کہتا ہے اگر میں جانتا کہ میں ان تک پہنچ سکتا ہوں تو ان کی ملاقات کے لئے تکلیف اٹھاتا اور اگر میں ان کے (یعنی رسول اللہ ﷺ) پاس ہوتا تو ان کے قدم دھوتا۔ بعض اہل علم مرسل ابن اسحٰق سے نقل کرتے ہیں کہ ہرقل نے کہا کہ تیری ہلاکت ہو اللہ کی قسم میں خوب جانتا ہوں کہ وہ نبی مرسل ہیں لیکن میں روم سے اپنے بارے میں ڈرتا ہوں۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا تو میں ان رسول کی ضرور پیروی کرتا۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے تلازم پر جن حدیثوں سے استدلال کیا ان کے بارے میں ملاعلی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

**واصحابنا اولوہ بان المراد المومن الکامل فی ایمانہ او ذو امن من عذاب اللہ تعالیٰ او المراد المومن المطیع للہ یقال امن لہ اذا انقاد و اطاع او معناہ الزجر والوعید او الانذار لمرتکب ھذہ الکبائر بسوء العاقبۃ اذ مرتکبھا لا یومن علیہ ان یقع فی الکفر الذی ھو ضد الایمان۔**

(ہمارے اصحاب نے اس حدیث کا یہ مطلب بتایا کہ مراد وہ مومن ہے جو کامل الایمان ہو یا جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن میں ہو یا وہ مومن ہے جو اللہ کا اطاعت گزار ہو جب انقیاد و اطاعت اختیار کرے تو کہتے ہیں آمن لہ یا اس سے مراد زجر و وعید ہے یا ان کبائر کے مرتکب کے لئے ڈراوا ہے برے انجام کا کیونکہ کبائر کے مرتکب پر اس سے امن نہیں ہوتا کہ کہیں وہ ایمان کی ضد کفر میں جا پڑے)۔

عکرمہ رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جب **لایزنی الزانی و ھو مومن** والی روایت سنی تو پوچھا **کیف ینزع الایمان منہ** (اس سے ایمان کیسے نکال لیا جاتا ہے گا؟) تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا **ھکذا وشبک بین اصابعہ ثم اخرجھا فان تاب عاد الیہ ھکذا وشبک بین اصابعہ** (اس طرح اور انہوں نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان داخل کر دیں۔ پھر ان کو نکال لیا اور فرمایا پھر اگر وہ توبہ کرے تو ایمان اس کی طرف دوبارہ اس طرح لوٹ آتا ہے اور دوبارہ اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کر دیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مومن تام نہیں ہوگا اور اس کے لئے نور ایمان نہیں ہوگا۔

ملاعلی قاری رحمہ اللہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

**ظاهر کلامه ان الایمان یخرج عن مرتکب هذه الاشیاء حین الارتکاب ولا یعود الیه الا بالتوبة و هو غیر مستقیم علی قواعد اهل السنة۔ فالتاویل ان کمال الایمان و نوره و ثمرته و نتیجته من الحیاء والخوف و الرحمة والشفقة والدیانة تفارقه فی تلک الحالة۔ والتائب من الذنب کمن لا ذنب له و ینصره قول الحسن البصری ان المعنی ینزع عنه اسم المدح الذی یسمی به اولیاؤه المومنون و یستحق الذم فیقال سارق و زان و فاسق۔**

(ان کا ظاہر کلام یہ ہے کہ ان کاموں کے مرتکب سے ارتکاب کے وقت ایمان نکل جاتا ہے اور پھر توبہ کرنے ہی سے واپس آتا ہے لیکن یہ بات اہلسنت کے قواعد کے موافق نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی تاویل یہ ہے کہ ایمان کا کمال اور اس کا نور اور اس کا ثمرہ ونتیجہ مثلاً حیاء خوف، رحمت، شفقت اور دیانت اس سے اس حالت میں علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی مانند ہوتا ہے اس کی تائید حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اس سے مومن جیسا قابل تعریف نام جو اللہ کے ولیوں کا ہوتا ہے کھینچ لیا جاتا ہے اور وہ قابل مذمت نام مثلاً چور، زانی اور فاسق کا مستحق بن جاتا ہے)۔

# باب:4

## ڈاکٹر اسرار صاحب کا اہلسنت کے خلاف عقیدہ کہ کسی گناہ پر اصرار ہمیشہ کے لئے جہنمی بناتا ہے

اوپر جس ZERO VALUE کا ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کہتے ہیں:
''اگر چہ قانون تو یہی بنتا ہے کہ اگر ایمان نہیں تو اطاعت قبول نہ ہو لیکن اللہ اپنی شان غفاری ورحیمی کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں''

''لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ اطاعت کلی ہو جزوی نہ ہو۔ الا یہ کہ کسی وقت جذبات و ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی لغزش ہو جائے اور نہایت پشیمانی کے ساتھ رجوع کرے توبہ کرے تو اور بات ہے۔ اللہ نے اس کی توبہ کو قبول کرنے کا ذمہ لیا۔

**اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ۔** (سورہ نساء:17)

اس کے مقابلے میں ایک معصیت سوچ سمجھ کر CALCULATIONS کر کے مستقل ڈیرا ڈال کر کی تو ایسا ایک گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنمی بنانے کے لئے کافی ہے۔ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْئَتُہٗ۔ وہ گناہ جو انسان کا احاطہ کرے وہ معاشی گناہ ہے کیونکہ یہ اکل حرام ہے جو ریشے ریشے میں سرایت کر جاتا ہے۔ (کیسٹ حقیقت و ماہیت ایمان)(کیسٹ ایمان اور اسلام)

ہم کہتے ہیں کہ:
یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب کے اس نکتے سے بحث مقصود ہے کہ ایک معصیت سوچ سمجھ کر مستقل ڈیرا ڈال کر کی تو ایسا

ایک گناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنمی بنانے کے لئے کافی ہے‘‘

اگرتو سوچ سمجھ کرمستقل ڈیرا ڈال کر سے مراد یہ ہے کہ وہ اس معصیت کے جائز اور حلال ہونے کا اعتقاد کر لیتا ہے یا شریعت کے حکم کو استخفاف واستہزاء کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ تو کفر ہے اور اس کفر کی بدولت وہ ہمیشہ کا جہنمی ہوگا۔

اور اگر مراد حلت کے اعتقاد اور استخفاف کے بغیر ہی وہ کسی معصیت کا برابر ارتکاب کئے جاتا ہے اور دل میں کفرنہیں آیا تو اگر چہ ڈاکٹر صاحب کے قاعدے کے مطابق وہ ہمیشہ کا جہنمی ہوگا کیونکہ ڈاکٹر اسرار صاحب ایمان تو اس کے دل میں مانتے ہی نہیں۔نفاق نہ ہونے کی وجہ سے اللہ نے اس کے اسلام کو اطاعت کلی کی شرط کے ساتھ قبول کیا تھا۔اطاعت کلی پائی نہیں گئی کیونکہ معصیت کا ارتکاب یہاں کسی وقتی ہیجان کے زیر اثر نہیں ، بلکہ سوچ سمجھ کر ہے، لہٰذا وہ اسلام بھی مقبول نہیں رہا اور وہ ہمیشہ کا جہنمی بن گیا۔لیکن اہل سنت کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔

آدمی کا کسی معصیت پر اصرار کرنے سے ہوسکتا ہے کہ ترقی کرتے کرتے اس کو کفر تک لے جائے لیکن اہلسنت کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک اس کے اندر کفرنہیں آجاتا اس کے اندر جو ایمان وتصدیق ہے اس کی وجہ سے وہ آخرکار جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

آگے دوحدیثیں مذکور ہیں جن سے ڈاکٹر اسرار صاحب کے عقیدہ کا باطل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

**عن ابی ذر قال اتیت النبی ﷺ ثوب ابیض و ھو نائم ثم اتیتہ و قد استیقظ فقال ما من عبد قال لا اِلٰہ الا اللّٰہ ثم مات علی ذالک الا دخل الجنۃ قلت و ان زنیٰ وان سرق قال و ان زنی و ان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی و ان سرق قلت و ان زنی وان سرق قال وان زنی و ان سرق علیٰ رغم انف ابی ذر۔**

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ایک سفید کپڑا اوڑھے سوئے ہوئے تھے۔میں دوبارہ آیا تو آپ جاگ چکے تھے آپ نے فرمایا جو بندہ بھی لا الٰہ الا اللہ کہے پھر اس پر مرجائے تو جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے کہا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے چوری کی ہو آپ نے فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے

چوری کی ہو۔ میں نے کہا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو میں نے پوچھا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے چوری کی ہو ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود۔

''**الادخل الجنة**'' کے قول کے تحت ملاعلی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

**فـفيه بشارة الىٰ ان عاقبته دخول الجنة و ان كان له ذنوب جمة لكن امره الى اللّٰه ان شاء عفا عنه و ادخله الجنة و ان شاء عذبه بقدر ذنبه ثم ادخله الجنة۔** (مرقات شرح مشکوۃ)

اس میں بشارت ہے کہ انجام کار جنت میں داخلہ ہوگا اگر چہ اس کے گناہ کثیر ہوں لیکن اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر ہوگا، چاہیں گے تو اس کو معاف فرما کر جنت میں داخل فرمائیں گے اور چاہیں گے تو اس کو اس کے گناہوں کے بقدر عذاب دیں گے پھر اس کو جنت میں داخل کریں گے۔

نیز اس حدیث میں ایسی کوئی قید نہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ یہ زنا اور سرقہ وہ ہے جو وقتی ہیجان کے باعث ہو گیا ہو نہ کہ وہ جو سوچ سمجھ کر کیا گیا ہو۔ نہ ہی یہ کہیں مذکور ہے کہ اس معصیت کا ارتکاب اتفاقیہ کبھی ہو گیا ہو نہ کہ اصرار اور تکرار کے ساتھ۔ پھر یہ کہ زنا اور سرقہ دونوں ہی ایسی معصیتیں ہیں جو عام طور پر سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں اور جن سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی یقیناً حرام ہے۔ اکل حرام کے باوجود حدیث سے اس بات کا امکان ملتا ہے کہ اس کو موت لا الہٰ الا اللہ پر آئے یعنی یہ تصدیق اس کے دل میں موجود ہو۔

**حـدثـنی سوید بن سعید ...... عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه...... فیقول الله تعالیٰ شفعت الملائکة و شـفـع الـنبیـون و شـفـع الـمومنون ولم یبق الا ارحم الراحمین فیقبض قبضة من النار فیخرج منها قوما لم یـعملوا قط قد عادوا حمما فیلقیهم فی نهر فی افواه الجنة یقال له نهر الحیاة فیخرجون کما تخرج الحبة فی جمیل السیل الا ترونها تکون الی الحجرا والی الشجر مایکون الی الشمس اصیفر و اُخَیضر و مایکون منها الـی الـظـل یکون ابیض فقالوا یا رسول الله کانک کنت ترعی بالبادیة قال فیخرجون کا للؤلؤ فی رقابهم الـخـواتیـم یـعـرفهـم اهل الجنة هولاء عتقاء اللّٰه الذین ادخلهم اللّٰه الجنة بغیر عمل عملوه ولا خیر قدموه۔**

(مسلم شریف ج 1 ص 102، درسی)

(اللہ تعالیٰ فرمائیں گے فرشتوں نے شفاعت کی اور انبیاء نے شفاعت کی، اور مومنوں نے شفاعت کی اور نہیں باقی رہا مگر ارحم الراحمین۔ پس اللہ تعالیٰ جہنم میں سے ایک مٹھی ایسے لوگوں کی نکالیں گے جنھوں نے کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہو گا۔ وہ کوئلہ ہو چکے ہوں گے پھر ان کو جنت کے اوائل میں ایک نہر میں ڈال دے گا اس کو نہر حیات کہا جاتا ہے پھر وہ نکلیں گے (نہر سے) جیسا کہ دانہ نکلتا ہے سیلاب کے محمول میں۔ کیا تم اس کو نہیں دیکھتے ہو کہ وہ حجر یا شجر کی جانب ہوتا ہے تو جو سورج کی جانب ہوتا ہے وہ زرد اور سبز رنگ کا ہوتا ہے اور جو ان میں سے سائے میں ہوتا ہے وہ سفید ہوتا ہے صحابہ نے کہا یا رسول اللہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جنگل میں چراتے تھے، آپ نے فرمایا پس وہ مثل موتیوں کے نکلیں گے ان کی گردنوں میں مہریں ہوں گی اہل جنت میں ان کی یہ پہچان ہو گی کہ یہ اللہ کے وہ آزاد کردہ ہیں جن کو اللہ نے جنت میں بغیر ان کے کسی عمل کے جو انہوں نے کیا ہو اور بغیر کسی بھلائی کے جو انہوں نے آگے بھیجی ہو (جنت میں) داخل کیا)۔

اب جس شخص نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا ہو اس کے بارے میں یہ تصور کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اس کا معاصی پر اصرار تھا اور اکل حرام پر دوام تھا (کیونکہ اکل حلال کو طلب کرنا تو خود ایک نیک عمل ہے) جب ایسے شخص کی بھی آخر کار نجات ہو سکتی ہے تو پھر کیا ڈاکٹر صاحب کے تمام دعاوی اور ان کی تمام تحقیقات اور ان کے تمام دلائل بیکار نہیں ہو جاتے؟

# باب:5

# ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک ڈارون کا قرآن

# وحدیث کے مخالف نظریہ ارتقاء درست ہے

نظریہ ارتقاء کے قائلین کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اس طرح نہیں ہوئی کہ پہلے مٹی گارے سے ان کا پتلا بنایا گیا ہو پھر اس میں روح پھونکی گئی ہو بلکہ ان کے نزدیک آدم اور حواء علیہا السلام انسانوں سے مشابہ بندروں کی اولاد تھے اور بندر بھی ہمیشہ سے بندر نہیں تھے بلکہ وہ اس سے پہلے کمتر درجے میں تھے۔ان کے نزدیک دنیا میں حیات کی ابتداء یکخلیاتی (UNICELLULAR) صورت میں شروع ہوئی جو کروڑوں اربوں سالوں میں مختلف جانداروں میں ارتقائی منازل طے کر کے انسان تک پہنچی۔ یہ نظریہ محض ایک مفروضہ ہے اور پہلے خیال تھا کہ حیات کا ابتدائی مظہر امیبا (AMOEBA) ہے لیکن نظریہ ارتقاء والوں کی سوچ مزید ترقی کر کے امیبا سے آگے نکل کر وائرس (VIRUS) تک پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک ریکارڈ شدہ تقریر ''قرآن اور نظریہ ارتقاء'' کے نام سے دستیاب ہے۔اس تقریر میں نظریہ ارتقاء کو قبول کرتے ہوئے:

1- ڈاکٹر اسرار صاحب نے قرآن پاک کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ۔ مِنْ طِيْنٍ لَازِبٍ۔ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَأٍ مَسْنُوْنٍ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آخر کہیں تراب اور کہیں طین اور کہیں طین لازب اور کبھی صلصال کا ذکر ہے تو اس میں کسی بات کی طرف اشارہ ہے پھر یہ نتیجہ نکالا کہ کیچڑ سوکھی اور مٹی کھنکھنانے لگی یعنی اس میں خمیر پیدا ہوا اور اس طرح سے پہلا ذی حیات امیبا AMOEBA وجود میں آیا اور امیبا عام طور پر جوہڑوں اور تالابوں میں

پایا جاتا ہے۔

2- وہ کہتے ہیں کہ اسلامی ادب میں بھی اس کی طرف اشارات موجود ہیں مثلاً مثنوی مولانا روم میں ہے۔

آمدہ اول باقلیم جماد — دز جمادی درنباتی اوفتاد

سالہا اندرنباتی عمر کرد — دز جمادی یادناوردازنبرد

وزنباتی چوں بحیوانی فتاد — نامدش حال نباتی، ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ داردسوی آں — خاصہ دروقت بہاروضیمراں

بازازحیواں سوی انسانیش — خاصہ دروقت بہاروضیمراں

3- وہ کہتے ہیں کہ انسان کا مبداء دنیوی معاملہ ہے اور حدیث أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ کی وجہ سے اس کی تعیین ہم اپنی سمجھ بوجھ اور اپنی تحقیقات سے کر سکتے ہیں۔

کچھ کہنے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ ہم اس نظریہ کی حیثیت اور حقیقت پر نظر ڈال لیں۔

زمین پر حیات کی ابداء کب ہوئی؟ ذی حیات اجسام کس شکل کے تھے۔اور آیا وہ اب بھی باقی ہیں یا ان میں انقلابات آ چکے ہیں۔ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب دینے کی ایک کوشش ڈارون اور دوسرے علمائے حیاتیات نے کی ہے۔ابھی تک اس کو ایک مفروضہ کی حیثیت حاصل ہے جس کو ہم اصطلاحاً وہم کہہ سکتے ہیں (یعنی جانب مرجوح) تفصیل کے لئے دیکھئے F.Sc میں داخل نصاب کتاب BIOLOGICAL SCIENCE جس کے متعلقہ اقتباسات کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

ایک ماہر حیاتیات ان سوالات کا مطالعہ کس طرح کرسکتا ہے۔زمین پر حیات کی ابتداء کب ہوئی تھی؟ سب سے ابتدائی

جاندار کس طرح کے تھے؟ کیا ابتدائی جانداروں میں سے اب تک کچھ باقی ہیں یا وہ تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ کچھ اور جانداروں نے لے لی ہے؟

اس بارے میں اب تک بہت سے مشکل سوالات اٹھائے جا چکے ہیں اور ہر معاملے میں ہم ایسے نتائج تک پہنچے ہیں جن کے لئے مشاہدہ و تجربہ کا اچھا خاصا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مبداء حیات کے بارے میں سوالات کا معاملہ ایسا نہیں ہے اور اسی وجہ سے ماہرین حیاتیات کو شبہ ہے کہ شاید زمین پر حیات کی ابتداء بہت قدیم زمانے میں ہوئی ہو گی۔ یہ تو بلا شبہ ناممکن ہے کہ ان واقعات کا مطالعہ کیا جا سکے جو ایک بہت زمانہ پیشتر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ کیونکہ ماہرین حیاتیات تو لاکھوں سال کی تاخیر سے جائے وقوع پر وارد ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ جو وہ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ ایسے طریقے تجویز کریں جن سے شاید حیات کی ابتداء ہوئی ہو۔

''ہائمین کا قول ہے کہ ایک خلیہ جاندار سے کثیر الخلیہ جاندار کی آفرینش کا کوئی براہ راست ثبوت نہیں ہے۔ پھر بھی کثیر الخلیہ جانداروں کی آفرینش کے بارے میں بحث اسی سوال کے گرد گھومتی رہتی ہے کہ کونسا یک خلیہ جاندار کثیر الخلیہ جانداروں کا غالباً مبداء بنا ہو گا دو وسیع احتمالات موجود ہیں جن کے تحت شاید کثیر الخلیہ جانداروں نے یک خلیہ جانداروں سے وجود حاصل کیا ہو گا۔

اس مسئلے میں زمانہ قدیم کے حیوانات و نباتات کا علم یعنی PALEONTOLGY بھی کوئی مدد نہیں دے سکتا کیونکہ کیمبرین (CAMBRIAN) دور کی ابتداء میں کثیر الخلیہ جاندار پوری طرح مستحکم ہو چکے تھے لہٰذا اغلب یہ ہے کہ کثیر الخلیہ جانداروں کی ابتداء ہمیشہ تخمینی رہے گی۔ لیکن بہت سے ماہرین حیوانات کی رائے یہ ہے کہ کثیر الخلیہ جاندار فلیجلا سے وجود میں آئے۔ ان کی اس رائے کی کئی وجوہات ہیں۔ لیکن اس گمان و تخمین SPECULATION کا مبنیٰ وہ مشاہدات اور تجربات ہیں جن کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف انتقال ہے۔

''ایسی بہت سی مثالیں اب معلوم ہیں جن میں دار و مدار ذوق پر ہے کہ دو ممتاز گروہوں کو مکمل انواع قرار دیا جائے یا ان کو ایک نوع کی اصناف قرار دیا جائے۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ مثالیں ہیں جن میں جغرافیائی اصناف کے دونوں سرے ایک جگہ پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں باہمی تناسل یا تو سرے سے نہیں ہوتا یا مکمل طور پر نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے بارے میں یہ خیال قائم کیا جاسکتا ہے کہ وہ مختلف انواع بن چکی ہیں''۔

اس کی عمدہ مثال وہ ہے جو BIOLOGICAL SCIENCE کے صفحہ 600 پر درج ہے۔

جغرافیائی تفریق کے ارتقائے انواع کے ساتھ تعلقات کی ایک واضح تصویر اس سے حاصل ہوتی ہے جس کو نسلوں کا دائرہ کہا جاتا ہے مثلاً جنوبی کیلیفورنیا کے ساحلی علاقوں میں ایک چھپکلی پائی جاتی ہے جو ہلکے لیکن ایک جیسے رنگ کی ہوتی ہے کچھ شمال کی جانب نسبتاً گہرے رنگ کی نسل پائی جاتی ہے۔ مزید شمال کی طرف اس سے بھی زیادہ گہرے رنگ کی نسل پائی جاتی ہے لیکن اس کا رنگ بھی ایک جیسا ہوتا ہے اور یہ ساحل سے لے کر اندر تک پائی جاتی ہے لیکن اور اندرونی علاقوں میں جنوب مشرقی جانب ایسی نسل پائی جاتی ہے جس پر دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ مزید جنوب کی جانب ساحلی علاقے سے خشک و گرم وادی کو پار کر کے سیرا انواڈا میں یہ دھبے مختلف قسم کے دھبوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آخر میں یہ دائرہ ایک اور نسل پر جا کر مکمل ہو جاتا ہے۔ جو زیادہ واضح دھبوں پر مشتمل ہے اور یہیں اس دائرے کا پہلا سرا بھی جو جنوبی کیلیفورنیا کے یک رنگی قسم پر مشتمل تھا پایا جاتا ہے۔ فرض کرلو کہ مذکورہ جغرافیائی دائرہ میں ترتیب سے پائی جانے والی ان نسلوں کے یا ان اصناف کے نام ا، ب، ج، د، س اور ش ہیں۔ ا، اور ب جہاں کہیں اکٹھے پائے جاتے ہیں ان میں باہمی تناسل پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ب اور ج میں اور ج اور د میں، د اور س میں اور س و ش کے مابین بھی باہمی تناسل موجود ہے۔

لیکن ہماری حیرت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ چیزیں جو کسی ایک متعین چیز کے مساوی ہیں ارتقاء میں ان میں آپس میں مساوات نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اور ش جہاں یہ ایک علاقے میں اکٹھے ہو جاتے ہیں آپس میں تناسل نہیں رکھتے یا بہت کم رکھتے ہیں۔ اگر کوئی قدرتی آفت ب سے لے کر س تک کی اصناف کو تباہ و معدوم کر دے تو ا

اورش بجائے ایک کے دومختلف انواع قرار دی جانے لگیں‘‘۔

اس مثال سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یہ درحقیقت ایک نوع ہی کی اصناف SUB-SPECIES ہیں نہ کہ علیحدہ علیحدہ انواع۔لیکن جولوگ ان کوعلیحدہ انواع شمار کرتے ہیں ان کے نزدیک وجہ یہ ہے کہ:۔

’’اگر دوآبادیوں میں بہت حدتک مشاکلت پائی جاتی ہو پھر بھی ان کو دومختلف انواع کی طرف تفویض کریں گے جب تک کہ ان کے درمیان کامیاب تناسل نہ ہواور وہ طاقتوراورزرخیزاولاد نہ جنیں‘‘۔

اگر چہ یہ علم حیاتیات کی ایک اصطلاح کا معاملہ ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ اختلاف انواع کے لئے کوئی حقیقی معیار نہیں۔ کیونکہ مختلف ماحول میں رہنے کی وجہ سے عادت میں اختلاف پیدا ہوسکتا ہے اور یہ چیز ان کی قدرتی جفتی میں کلی یا جزوی مانع بن سکتی ہے۔

ارتقاء کے مجوز ماہرین حیاتیات کے نزدیک حیات کی ابتداء وائرس VIRUS سے ہوئی ہے۔وائرس کی دریافت سے پہلے امیبا AMOEBA کو ابتدائی مظہر سمجھا جاتا تھا لیکن اب وائرس کی سادہ تر ترکیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو یہ مقام دیا گیا ہے۔

’’امیبا سے انسان تک‘‘ کی تعبیر عام طور پر استعمال کی جاتی ہے۔گویا کہ یہ ارتقاء کی عظیم وسعت کو محیط ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ امیبا سے بھی مقدم تر حیات کے ابتدائی مراتب کا وسیع میدان موجود ہے۔ یک خلیاتی جانداروں میں فلیجلا اب پوری دنیا میں امیبا کی جنس رھائی زو پوڈا کے مقابلے میں قدیم تر مانی جاتی ہے اور غالبًا امیبا کے اجداد میں سے ہے۔ بلاشبہ بہت سے فلیجلا مثلاً یوگلینا سبزہ مادہ (کلوروفل) اور دیگر نباتاتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ عالم حیوانات اور عالم نباتات کے درمیان ایک کڑی مہیا کرتے ہیں۔

لیکن فلیجلا خود، انتہائی پیچیدہ جاندار ہیں کہ ان کو میدان حیات کا نقطہ آغاز تسلیم کرنا دشوار ہے۔ سائنی فائٹا نیلگوں سبز ایلجی اس سے بھی زیادہ ابتدائی ہیں۔ ان میں مرکزہ اور سائٹو پلازم کی مخصوص تفریق موجود ہے لیکن کروماٹن پورے خلیے میں منتشر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جاندار بھی بیکٹیر یا یعنی جراثیم کے مقابلے میں خاصے ترقی یافتہ ہیں کیونکہ نیلگوں سبز ایلجی کلوروفل کی کیٹالیٹک (Catalytic) خصوصیات کی بناء پر سورج کی روشنی میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی سے شکر بناتے ہیں اس کے باوجود جراثیم کو مشکل ہی سے سادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ان کے پروٹو پلازم کا کیمیائی تجزیہ اس نتیجہ سے زیادہ مختلف نہیں جو کہ اونچے درجے کے حیوانی یا نباتاتی پروٹو پلازم کے تجزیے سے حاصل ہوتا ہے ان کی ساخت اور کالونی کی خصوصیات اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ یہ بہت چھوٹے جراثیم میں بھی شناخت کا کام دیتی ہیں لیکن بیماری کی موجب کچھ اور چیزیں ہیں جو انتہائی باریک فلٹر (چھلنی) میں سے بھی گزر جاتے ہیں، یہ وائرس کہلاتے ہیں وائرس کی قلمیں بھی بنائی گئی ہیں اور یہ قلمیں نیوکلو پروٹین ہیں جو کہ مخصوص پروٹو پلازم کے مقابلے میں انتہائی سادہ ہیں لیکن جب ان کا تقابل غیر نامیاتی یا بہت سے نامیاتی مالیکیول سے کیا جائے تو بہت پیچیدہ نظر آتے ہیں۔

پھر ماہرین حیات کے نزدیک وائرس کا وجود مٹی، کیچڑ یا کھنکھناتی مٹی کا بھی محتاج نہیں تھا۔'' اور اس لئے یہ عمل شروع ہو گیا ہو گا۔ ابتدائی فضائی گیس برق اور ماورائے بنفشی روشنی کی موجودگی میں متحد ہو کر سادہ نامیاتی مرکبات میں تبدیل ہو گئی ہو گی جوں جوں زمین ٹھنڈی ہوتی گئی آبی بخارات جم کر تالاب، دریا اور سمندروں میں منتقل ہو گئے ہوں گے۔ سادہ نامیاتی مواد ان پانیوں میں لاکھوں سالوں میں جمع ہوتے گئے ہوں گے اس یخنی کے مرکبات کے بارے میں توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے میں عمل کر کے مختلف کیمیائی چیزیں بنائی ہوں گی۔ ہم یہ فرض کر چکے ہیں حیات کی ابتدائی صورتوں نے ان محیط سمندر کے نامیاتی مرکبات کو اپنی زندگی اور تناسل کے لئے استعمال کیا ہو گا۔

اس سارے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1- نظریہ ارتقاء ابھی تک محض ایک مفروضہ اور قیاس آرائی ہے۔ اور اگر چہ اس کے لئے کچھ شواہد بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن وہ خود کامل اور تام نہیں۔ خصوصاً عالم حیوانات اور اس میں بھی بالخصوص انسان کے بارے میں تو یہ ابھی مفروضہ اور قیاس آرائی سے کچھ زیادہ نہیں۔

2- حیات کی ابتدا وائرس سے ہوئی جس کے وجود کے لئے مٹی وغیرہ کی حاجت نہیں تھی۔

محض ایک مفروضہ اور وہ بھی جو متروک ہو گیا ہو اس کی بنیاد پر قرآن و حدیث کی تصریحات کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ دور از کار تاویلات کرنا ڈاکٹر اسرار صاحب کی بڑی زیادتی ہے جس میں وہ کسی بھی درجہ میں معذور نہیں ٹھہرتے۔

نظریہ ارتقاء قرآن وحدیث کی واضح تصریحات میں باطل ہے

**اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ** (سورہ آل عمران:59)

﴿بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال جیسی ہے۔ اللہ نے پیدا کیا آدم کو مٹی سے﴾۔

علامہ رازیؒ فرماتے ہیں:

**اجمع المفسرون علیٰ ان ھذہ الأیة نزلت عند حضور وفد نجران علی الرسول ﷺ و کان من جملة شبھھم ان قالوا یا محمد لما سلمت انه لا اب له من البشر وجب ان یکون ابوہ ھو اللّٰہ تعالیٰ فقال ان آدم ما کان له اب ولا ام ولم یلزم ان یکون ابنا للّٰہ تعالیٰ فکذا القول فی عیسیٰ علیه السلام** (تفسیر کبیر)

مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نجران کے وفد کے حضور ﷺ کے پاس آنے کے وقت نازل ہوئی۔ ان کے شبہات میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اے محمد جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری والد نہ تھے تو لازم آیا کہ ان کے والد اللہ تعالیٰ ہوں تو آپ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے نہ باپ تھے نہ ماں ان کے لئے یہ لازم نہیں ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہوں تو ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (کیسے لازم ہو گیا کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہوں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر اتفاق تھا۔ ان کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ ان کا بغیر باپ کے ہونا ایسا ہی ہے جیسے آدم علیہ السلام کا بغیر باپ (اور ماں) کے ہونا۔

جب اس آیت کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام کے ماں باپ نہ تھے تو نظریہ ارتقاء باطل ہوا کیونکہ اس نظریہ کی رو سے ان کے ماں باپ دونوں ہونے چاہئیں۔

2- **وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِیْنٍ**

﴿اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی پھر اس کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی نطفہ سے بنایا﴾۔ (سورہ سجدہ 8:)

الانسان میں لام عہد کا ہے اور مراد خاص آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ لام جنس کا نہیں ہے کیونکہ آگے فرمایا ''اس کی نسل'' جب کہ جنس تو محض ایک عقلی مفہوم ہوتا ہے اس کی نسل نہیں ہوتی۔ اس آیت میں بتایا کہ آدم علیہ السلام کو گارے سے بنایا اور ان کی نسل کی تخلیق نطفہ سے کی۔ یعنی دونوں کی تخلیق جدا جدا طریقے سے ہوئی جب کہ نظریہ ارتقاء کو تسلیم کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا بھی نطفہ سے پیدا ہونا ضروری ہے۔

ثُمَّ کا لفظ مؤخر ہونے کا معنی دیتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد ان کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ حضرت حوا علیہا السلام بھی نطفہ سے پیدا نہیں ہوئیں جب کہ نظریہ ارتقاء کے مطابق وہ بھی نطفہ سے پیدا ہوئیں۔

3- **یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَاءً** (سورہ نساء 1:)

﴿اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں﴾۔

اس آیت میں لفظ منھا کی ضمیر سے مراد نفس واحدہ ہے اور منھما کی ضمیر سے مراد نفس واحدہ اور اس کا زوج (جوڑا) مراد ہے اور ان دونوں سے ان کی اولاد و نسل پھیلائی جو بہت سے مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔ ان دو کا مصداق آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام ہیں۔ پھر اسی آیت سے معلوم ہوا کہ حوا علیہا السلام کی تخلیق آدم علیہ السلام سے ہوئی۔

نظریہ ارتقاء والے نفس واحدہ سے امیبا مراد لیں اور یہ کہیں کہ آگے کے ارتقائی مراحل میں جا کر کہیں نر اور مادہ میں تفریق ہوئی اور پھر جب وہ انسانی صورت میں متشکل ہو گئے تو ان سے بہت سے انسان پیدا کئے۔ یہ وہ دور از کار تاویلات ہیں الفاظ جن کا کسی طور سے ساتھ نہیں دیتے۔ پھر تاویل کرنے کی کوئی مجبوری بھی تو ہو جو عقائد میں کسی شرعی یا عقلی محال کے لازم آنے سے ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء مٹی کے پتلے سے مانی جائے تو نہ کوئی شرعی محال لازم آتا ہے اور نہ کوئی عقلی محال لازم آتا ہے۔

4- صحیح مسلم کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

**لما صور الله آدم فی الجنة ترکه ماشاء الله ان یترکه فجعل ابلیس یطیف به فینظر ما هو فلما راه اجوف عرف انه خلق خلقا لا یتمالک۔**

جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں آدم کی صورت بنائی تو جب تک چاہا اس کو (یونہی) چھوڑے رکھا۔ ابلیس اس کے گرد گھومنے لگا کہ دیکھے یہ کیا ہے؟ جب دیکھا کہ یہ اندر سے کھوکھلا ہے تو جان لیا کہ ان کو ایسے پیدا کیا ہے کہ ان میں ثبات نہیں ہے۔ غرض ارتقائی طریقہ سے تخلیق انسانی کا نظریہ اور عقیدہ قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے۔

II- ڈاکٹر اسرار صاحب نے جن الفاظ قرآنی سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا فائدہ اور مطلب اس صورت میں بھی نکلتا ہے جب ہم آدم علیہ السلام کی تخلیق کا قرآنی عقیدہ مانیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سورہ حجر کے تفسیری حاشیہ پر مختلف الفاظ کے استعمال کے فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''آدمی کی پیدائش کے متعلق یہاں دو لفظ فرمائے''صَلْصَالٍ'' بجنے والی کھنکھناتی مٹی جو آگ میں پکنے سے اس حالت کو پہنچتی ہے۔اسی کو دوسری جگہ **کَالْفَخَّارِ** ''فرمایا اور''**حَمَأٍ مَسْنُوْنٍ** ''سڑا ہوا گارا جس سے بو آتی ہو،خیال یہ ہوتا ہے کہ اول سنے ہوئے گارے سے آدم کا پتلا تیار کیا۔پھر جب خشک ہو کر اور پک کر کھن کھن بجنے لگا تب مختلف تطورات کے بعد اس درجہ پر پہنچا کہ انسانی روح پھونکی جائے۔

روح المعانی میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔**کانہ سبحانہ افرغ الحماء فصور من ذلک تمثال انسان اجوف فیبس حتی اذا تقرصوت ثم غیر طورا بعد طور حتی نفخ فیہ من روحہ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔**

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔مٹی پانی میں تر کی اور خمیر اٹھایا کہ کھن کھن بولنے لگی وہ ہی بدن ہوا انسان کا اس کی خاصیتیں سختی اور بوجھ اس میں رہ گئیں۔اسی طرح گرم ہوا کہ خاصیت (حدت وخفت) جنات کی پیدائش میں رہی۔

راغب اصفہانی نے ایک طویل مضمون کے ضمن میں متنبہ کیا ہے کہ **حمأ مسنون** اور **طین لازب** وغیرہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ مٹی اور پانی کو ملا کر ہوا سے خشک کیا اور فخار کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ کسی درجہ میں آگ سے پکایا گیا۔یہی ناری جزء آدمی کی شیطنت کا منشاء ہے اسی مناسبت سے ایک جگہ فرمایا:

**خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ و خَلَقُ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ**۔(سورہ رحمٰن:14)

III- مولانا روم رحمہ اللہ نے اپنے اشعار میں جس ارتقا کا تصور دیا ہے وہ ڈارون کا ارتقاء نہیں ہے اور ہو بھی کیوں کر جب کہ یہ نصوص کے بھی خلاف ہے اور اس پر کوئی ٹھوس دلیل بھی نہیں بلکہ مولانا کی مراد وہ ہے جو بحر العلوم رحمہ اللہ نے مثنوی کی شرح میں لکھی ہے یعنی قولہ،آمدہ اول باقلیم جماد۔

**قال اللّٰہ تعالیٰ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ**۔(سورہ مومنون:12)

تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو گارے کے خلاصے سے پھر ہم نے اس کو مضبوط مکان میں نطفہ بنایا۔

''ہرآئینہ پیدا کردم انسان راازسلالت وخلاصہ ازطین یعنی اجزائے زمین مخلوط بآب یعنی پیدا کردم آدم راازخلاصہ طین پستر گرد انیدم نطفہ انسان رانطفہ یعنی درقرار مکین یعنی نسل آدم ازمنی وسلالت طین ظاہرست کہ جمادست ومنی رانیز جماداعتبار کروند کہ در ظاہراورانمونیست مگر بہ تبعیت بدن۔ **ثم خلقنا النطفة علقة فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً** پستر گردانیدم نطفہ راعلقہ خون بستہ پس پیدا کردیم علقہ رامضغہ درمدت استحالت منی سوئے علقہ وعلقہ سوئے مضغہ اورا موانست ظاہر النبات سوائے نمو ام واینست معنی قول وی قدس سرہ از جمادی درنباتی اوفتاد''۔

بے شک میں نے پیدا کیا انسان کو طین یعنی زمین کے پانی ملے اجزاء کے خلاصے سے، یعنی میں نے پیدا کیا آدم کو گارے کے خلاصے سے پھر کردیا ہم نے انسان کو نطفہ یعنی قرار مکین میں۔ یعنی نسل آدم منی سے ہے اور ظاہر ہے کہ خلاصہ طین جماد ہے اور منی کو بھی جمادات میں شمار کرتے ہیں کیونکہ ظاہر میں اس میں نمو نہیں ہے مگر بدن کے تابع ہوکر۔ پھر بنادیا ہم نے نطفہ کو علقہ جما ہوا خون پھر بنایا ہم نے جمے ہوئے خون کو مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) منی کے علقہ اور علقہ کے مضغہ بننے کی مدت میں اس کو نباتات کے ساتھ ظاہری موانست حاصل ہے اور یہی معنی ہے مولانا قدس سرہ کے قول از جمادی درنباتی اوفتادکا۔

**ثم انشاناه خلقا آخر فتبارک الله احسن الخالقین.**

''پستر پیدا کرویم آنرا پیدائش آخر یعنی آنرا انسان گردانیدم ونفخ روح کردیم۔ پس صاحب برکت ست اللہ درحالیکہ احسن خالقاں اوست وباینست اشارت درقول وی قدس سرہ۔ باز ازحیوان سوئے انسانیش الخ (دفتر چہارم)''

پھر ہم نے اس کو ایک اور خلقت عطا کی یعنی اس کو ہم نے انسان بنادیا اور اس میں روح پھونکی۔ پس برکت والا ہے اللہ اس حال میں کہ وہی احسن الخالقین ہے اور اسی کی طرف اشارہ ہے ان کے قول ''باز ازحیوان سوئے انسانیش'' میں۔

## **باب**: 6

# ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور دین و مذہب

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے اپنے بندوں پر اپنی اطاعت کی جو باتیں مقرر فرمائی ہیں تا کہ ان کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رحمت حاصل کریں ان سب باتوں کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں اور اس دین کا نام اسلام ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے: **وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ** (آل عمران: 85) اور جو کوئی چاہے اسلام کے علاوہ دین کو تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا۔

دین کی باتیں دو طرح کی ہیں۔

1- کچھ وہ ہیں جو اصولی ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوتیں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت اور دیگر ایمانیات مثلاً انبیاء علیہم السلام پر، فرشتوں پر، کتب سماویہ پر، قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان رکھنا اور یہ ایمان رکھنا کہ احکام صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں اور ان کے دیئے ہوئے احکام کو بجالانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ان ہی باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اخلاق فاضلہ کو ہے۔ پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کو آخری شریعت دی گئی۔ فرمایا:

**ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا** (جاثیہ: 18)

﴿ پھر ہم نے آپ کو کیا دین کے ایک طریقہ پر ﴾

اور چونکہ آپ کے بعد کوئی اور نئی نبوت نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ کی شریعت غیر متبدل ہے۔

ایک اور اصطلاح ملت کی ہے۔ یہ دین کے ہم معنی ہے البتہ دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دین کی اضافت ونسبت خدا رسول اور امت ان سب کی طرف ہوسکتی ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کا دین، رسول خدا کا دین اور امت کے ایک فرد مثلاً زید کا دین جب کہ ملت کی اضافت ونسبت صرف رسول کی طرف ہوسکتی ہے خدا کی طرف اور امت کی طرف نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں فرمایا: **مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفاً**

## دین کی باتوں کی تفصیل

دین کی باتیں پانچ قسم کی ہیں۔

1- عقائد 2- عبادات 3- معاملات 4- سزائیں 5- آداب

ان میں سے آداب کو چھوڑ کر باقی ہر ایک کی پھر موٹی موٹی پانچ قسمیں ہیں:

### عقائد

(1) اللہ تعالیٰ پر ایمان (2) فرشتوں پر ایمان

(3) کتب الٰہیہ پر ایمان (4) رسولوں پر ایمان

(5) یوم آخرت پر ایمان

### عبادات

(1) نماز (2) زکوٰۃ (3) روزہ (4) حج (5) جہاد

### معاملات

(1) مالی معاملات (2) عائلی معاملات مثلاً نکاح طلاق وغیرہ

(3) باہمی جھگڑے اور امور عدالت (4) کسی پر بدکاری کا ناحق الزام لگانے پر

(5) کسی مسلمان کے اسلام ترک کرنے پر

### آداب

(1) اخلاق (2) اچھے طور طریقے اور عمدہ باتیں

(3) حکومتی امور (4) معاشرتی امور

مذکورہ بالا تفصیل کے برخلاف ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

''دین اپنی فطرت کے اعتبار سے غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ چنانچہ انگریز کے دور غلامی میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ دین انگریز تھا۔ تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاع مطلق برطانوی پارلیمان تھی''۔ (ص 92 مطالبات دین)

''معلوم ہوا کہ ہر نظام غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں بلکہ دین ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ **ان الــدیــن عــند اللّٰه الاسلام**'' تو اس کو غلبہ درکار رہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دوسو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہوگئی تھی ...... میں بڑے عزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے''۔ (ص 186 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

ان ملفوظات میں ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں کہیں ہیں:

(1) دین و مذہب کے درمیان فرق

(2) اسلام جب غالب نہ ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے دین نہیں۔ ہم ان دونوں باتوں پر بالترتیب اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

کیا دین و مذہب کے درمیان فرق ہے؟

اس بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب مزید لکھتے ہیں،

''جدید ذہن دین کو زندگی کا ایک نجی PRIVATE معاملہ قرار دیتا ہے اور دین کو لفظ مذہب کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں مذہب کا یہی تصور راسخ ہوگیا ہے یہ تصور درست نہیں ہے۔ چونکہ اسلام مذہب ہرگز نہیں ہے بلکہ در

اصل دین ہے **ان الدین عند اللہ الاسلام**۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعدالطبیعیات عقائد اوران عقائد کے تحت چند رسوم عبودیت کی انجام دہی اور چند رسوم معاشرت کی پابندی کر لی جائے تو مذہب کا تقاضا پورا ہو گیا اوران رسوم کا تعلق انسان کی ذاتی، شخصی اور نجی زندگی ہی سے ہے۔

اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ پورے کے پورے قرآن مجید اور دخیرہ احادیث نبوی میں ہمارے دین کی تعبیر کے لئے کسی جگہ بھی لفظ ''مذہب'' استعمال نہیں ہوا بلکہ اصل اصطلاح ''دین'' استعمال ہوئی ہے''۔(ص 92 رسالہ مطالبات دین)

''دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکم مطلق اور حقیقی مقنن تسلیم کر کے اس کی جزا کی امید اور اسی کی سزا سے خوف کرتے ہوئے صرف اسی کے قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی دی ہوئی شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو انجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت میں پوری زندگی کو جکڑ دیا جائے''۔
(ص 92 رسالہ مطالبات دین)

گویا ڈاکٹر صاحب نے دین و مذہب کے درمیان جو فرق کیا ہے وہ یہ ہے کہ دین تو کسی ذات کو مطاع مطلق مان کر اس کی کامل اطاعت کرنے کا نام ہے اور مذہب چند مابعدالطبیعاتی عقائد اور چند رسوم عبودیت و معاشرت کا نام ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر اسرار صاحب نے خاصے دلکش پیرائے میں بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔لیکن ایک تو یہ بات اصولاً غلط ہے دوسرے اس میں کچھ مفاسد بھی مضمر ہیں جن کی ہم نشاندہی کریں گے (انشاءاللہ تعالیٰ) کتب لغت میں ان الفاظ کے معنی یوں بیان ہوئے ہیں۔

**المنجد میں :الدین ج ادیان: الطاعة۔ رسم لجمیع مایعبد به الله۔ الملة و المذهب۔**

**المذهب ج مذاهب:المعتقد۔ الطریقه۔ الاصل**

**مصباح اللغات میں:** دین: مذہب وملت۔

فرہنگ آصفیہ: دین: کیش، مذہب، ملت، پنتھ،

مذہب: دین، آئین عقیدہ، ملت، کیش۔

**المورد میں:** دین، RELIGION

Oxford Pocket Dictionary میں ہے۔

Religion: System of faith and worship Human recognition of a Personal God ertitled to obedience.

معلوم ہوا کہ دین۔ملت، مذہب اور RELIGION یہ سب الفاظ ایک معنی کی ادائیگی کے لئے بھی وضع ہوئے ہیں اور استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ عربی زبان میں دین کا لفظ زیادہ مستعمل ہے جب کہ اردو زبان میں دین کے معنی میں مذہب کا لفظ بھی کثیر الاستعمال ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب کا ہر حال میں دین و مذہب کے درمیان فرق سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ آپس میں مترادف بھی ہیں۔

باقی ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ ''مذہب کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعیات عقائد الخ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مذہب کا لفظ مذکورہ محدود معنی کے لئے وضع ہوا ہے (فرہنگ آصفیہ دیکھیں تو مذہب کا یہ مطلب کہیں لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ وہ کچھ عقائد اور کچھ رسوم عبودیت ومعاشرت کا نام ہے) بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں جب فکری وصنعتی انقلاب وضع ہوا اور کلیسا کی جانب سے بہت سی باتوں پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور سائنسی تحقیقات کرنے والوں کو اپنی تحقیقات اور دریافتوں پر عقوبتیں برداشت کرنی پڑیں تو کلیسا کے خلاف روعمل پیدا ہوا، اور لوگوں نے بے لگام کلیسا کو محض چند عقائد اور چند مذہبی ومعاشرتی رسومات تک محدود کردیا۔

کلیسا کے خلاف یہ ردعمل قابل فہم بھی ہے کیونکہ کلیسا نے واقعی اپنی حد سے تجاوز کیا تھا۔ بہرحال اس بحث سے قطع نظر بات اتنی ہے کہ دین، مذہب، ملت اور RELIGION کے مفہوم کو یورپ والوں نے عملاً چند عقائد ورسومات تک محدود کر

دیا اور باقی معاملات میں خودمختار ہو گئے RELIGION کو انہوں نے ایک شخص کا نجی اور پرائیویٹ معاملہ سمجھ لیا چونکہ اردو میں دین وملت کے لئے مذہب کا لفظ بھی کثیرالاستعمال ہے، اس لئے RELIGION کا عام طور پر ترجمہ مذہب کیا جاتا ہے۔

اس لئے مودودی صاحب کی اتباع میں ڈاکٹر صاحب نے یہ خیال کیا کہ RELIGION کے لفظ میں عملاً جو محدودیت ہے، وہ لفظ مذہب میں بھی ہوگی اور یہ خیال نہ رہا کہ مذہب کا لفظ دین کا مترادف بھی ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو مغرب کی تقلید میں دین و مذہب کا ایسا ہی محدود تصور رکھتا ہے لہٰذا اس خیال کی مزید تائید بھی ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایسا خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ:

(1) عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لفظ مذہب دین کا مترادف بھی ہے جیسا کہ لغت کے حوالوں سے معلوم ہوا۔

(2) لفظ RELIGION کے مفہوم میں عملاً محدودیت واقع ہوئے تقریباً دوسو سال ہو گئے ہیں جب کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومتیں ابھی قائم تھیں۔ اسلام کو اس وقت بھی RELIGION کہا جاتا تھا۔ یہاں دین کا مطلب خاص طرز اور ضابطہ کے مطابق عمل کرنا، معاملات سرانجام دینا اور زندگی بسر کرنا بتایا۔

2- مطالبات دین کے ص 91 پر لکھتے ہیں۔

''دین کے معنی ہیں ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنن اور حاکم مطلق مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے''۔

''لہٰذا دیکھ لیجئے یہاں بادشاہی کے اس پورے نظام کو جو بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد پر مصر میں رائج تھا دین الملک سے تعبیر کیا گیا''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کا مطالب رائج ضابطہ حیات اور نظام زندگی بتایا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ضابطہ حیات اور نظام زندگی اور چیز ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اور اس پر عمل کرنا اور چیز ہے۔

3- مطالبات دین ص 96 پر لکھتے ہیں۔

''دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا، مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح روبعمل ہوگی، کس کے واسطے ہوگی، کون اس کا نمائندہ ہوگا''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کو آئین (CONSTITUTION) کے معنی میں بتایا ہے۔ آئین تو ایک فکری چیز ہے جس پر ایک نظام قائم کیا جاتا ہے اور لوگ اس نظام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز دوسرے سے جدا حقیقت رکھتی ہے۔

4- مطالبات دین ص 95 پر لکھتے ہیں۔

''دین حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک سب انبیاء ورسول کا ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کسی دور میں بھی قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ سب کا دین ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل توحید کے ساتھ،۔ ملائکہ، نزول کتب اور ارسال انبیاء پر ایمان اور بعث بعد الموت، حشر ونشر، حساب کتاب، جزا وسزا اور جنت و دوزخ یعنی آخرت میں پیش آنے والے تمام احوال پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ حاکم مطلق صرف اللہ ہے وہی مقنن حقیقی ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے یہاں دین کو آئین کے معنی تو دیئے ہیں لیکن اس کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں بھی شامل کردی ہیں جن کا اصل موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ خود ہی ص 96 پر وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے، حاکم کون ہے، حاکمیت کس کی ہے، قانون کس کا چلے گا......

الخ''۔

اب سابقہ انبیاء ورسل پر ایمان لانا، سابقہ کتابوں پر ایمان لانا، حضرت جبرئیل علیہ السلام کے علاوہ دیگر فرشتوں پر ایمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا ان باتوں کا ڈاکٹر اسرار صاحب کے بتائے ہوئے اصل موضوع سے تو کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

## ڈاکٹر اسرار صاحب کی اس غلطی کا منبع

ڈاکٹر اسرار صاحب نے دین کا جو معنی بتایا ہے وہ انہوں نے مودودی صاحب سے لیا ہے جو اپنی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

''کلام عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) غلبہ واقتدار، حکمرانی وفرماں روائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اس پر اپنی قوت قاہرہ استعمال کرنا، اس کو اپنا غلام اور تابع امر بنانا۔

(2) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لئے مسخر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا، کسی کے غلبہ وقہر سے دب کر اس کے مقابلہ میں ذلت قبول کر لینا۔

(3) شریعت وقانون، طریقہ کیش وملت، رسم وعادت۔

(4) جزاوعمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ،

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ دین کی بنیاد میں چار تصورات ہیں یا بالفاظ دیگر یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے:

(1) غلبہ وتسلط کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔

(2) اطاعت، تعبد اور بندگی صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والی کی طرف سے۔

(3) قاعدہ وضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

(4) محاسبہ اور فیصلہ اور جزا وسزا۔

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت زیادہ بلند بھی نہ تھے۔ اس لئے اس لفظ کے استعمال میں ابہام پایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی باقاعدہ نظام فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا، قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لئے مناسب پا کر بالکل واضح و متعین مفہومات کے لئے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے۔

(1) حاکمیت واقتدار اعلیٰ۔

(2) حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم واطاعت۔

(3) وہ نظام فکر وعمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر بنے۔

(4) مکافات جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری واطاعت کے صلے میں یا سرکشی وبغاوت کی پاداش میں دی جائے۔ قرآن کبھی لفظ دین کا اطلاق معنی اول ودوم پر کرتا ہے، کبھی معنی سوم پر، کبھی معنی چہارم پر اور کہیں الدین بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزا سمیت مراد لیتا ہے۔

اسی کتاب کے ص 153 پر لکھتے ہیں۔

''یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ جس میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے ایک ایسا نظام زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت وفرمانبرداری قبول

کر لے۔ اس کے حدود ...... اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو، اور اس کی نافرمانی پر ذلت وخواری اور سزا سے ڈرے۔ غالبًا دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ STATE کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔

حسب ذیل آیات میں دین اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

**قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ.** (سورہ توبہ: 29)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں (یعنی اس کو واحد مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے، نہ یوم آخرت (یعنی یوم الحساب اور یوم الجزاء کو مانتے ہیں نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

**وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ أَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗٓ اِنِّیْٓ أَخَافُ أَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ أَوْ أَنْ يُّظْهِرَ فِى الْأَرْضِ الْفَسَادَ۔ ﴿المومن، 26﴾**

﴿فرعون نے کہا چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل ہی کئے دیتا ہوں اور اب پکارے وہ اپنے رب کو مجھے خوف ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد نہ کھڑا کر دے﴾۔

قرآن میں قصہ فرعون وموسیٰ کی جتنی تفصیلات آئی ہیں۔ ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد مذہب کے معنی میں نہیں آیا ہے۔ بلکہ ریاست اور نظام تمدن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظام زندگی اس وقت فراعنہ کی حاکمیت اور رائج الوقت قوانین ورسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جڑ سے اکھڑ جائے گا اور اس کی جگہ یا تو دوسرا نظام بالکل ہی دوسری بنیادوں

پر قائم ہو گا یا نہیں تو سرے سے کوئی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا بلکہ تمام ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

**اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔** (آل عمران۔ 19)

﴿اللہ کے نزدیک دین تو دراصل اسلام ہے﴾۔

(آل عمران: 85)

﴿اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا﴾۔

**ھُوَالَّذِیۡ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡکَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ۔** (توبہ: 33)

﴿وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح رہنمائی اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو پورے جنس دین پر غالب کر دے اگرچہ شرک کرنیوالوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو﴾۔

**وَقَاتِلُوۡھُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ** (انفال: 39)

﴿اور تم ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے﴾۔

**اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔**

﴿جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس سے درگزر کی درخواست کرو۔ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے﴾۔

ان سب آیات میں دین سے پورا نظام زندگی اپنے تمام اقتصادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے''۔

(ص 152 تا ص 155 قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)۔

## جواب

مودودی صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ پانچواں معنی ان کے بقول قرآن پاک کی اپنی اصطلاح ہے۔ جس کا تصور عربوں میں نہیں تھا۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا لغوی یا شرعی اعتبار سے یہ معنی صحیح ہے۔

جہاں تک لغت کا تعلق ہے تو چونکہ یہ حقیقی معنی نہیں ہے لہٰذا مجاز ہوا، اور یہ لغت کا قاعدہ ہے کہ مجاز کی طرف صرف اس وقت رخ کریں گے جب حقیقت مراد لینا ممکن نہ ہو حالانکہ آیت نمبر 1 تا 6 میں دین کا مطلب طریقہ لینا ممکن ہے اور آیت نمبر 7 میں اطاعت کا معنی کرنا بھی ممکن ہے۔ پس لغوی و عقلی قواعد کی بناء پر حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

شرعاً دیکھا جائے تو دین کا ایسا معنی جیسا کہ مودودی صاحب نے ذکر کیا ہے نہ تو وضاحت کے ساتھ قرآن پاک میں کہیں مذکور ہے نہ ذخیرہ احادیث میں اور نہ ہی کسی تفسیر میں۔

پس مودودی صاحب (اور ان کی اتباع میں ڈاکٹر اسرار صاحب) نے دین کے جو اصطلاحی معنی اختراع کئے ہیں وہ بے بنیاد اور بلا دلیل ہیں۔ اور پھر یہ غلطی اس بنا پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے کہ ان دونوں صاحبان میں تفسیر کرنے کی سرے سے اہلیت وصلاحیت بھی نہیں ہے۔

# باب: 7

## ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور اقامت دین

تصور دین کے بارے میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے انتشار ذہنی اور دیگر اغلاط سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ان کے دیئے ہوئے تصور اقامت دین کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی گمراہی سے خالی نہیں ہے۔
ڈاکٹر اسرار صاحب نے اقامت دین کے لئے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

**شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ أَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔** (سورہ شوری: 13)

﴿اے مسلمانوں! تمہارے لئے ہم نے مقرر کیا از جنس دین وہی جس کی وصیت کی تھی نوحؑ کو اور جو وحی کیا گیا ہے اے نبی تیری جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کہ دین کو قائم کرو﴾۔
بعد میں لکھتے ہیں:

''اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا اور خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پایا اس کے نزول کا مقصد تھا اس دین اللہ کا بالفعل قیام ونفاذ۔ چنانچہ آیت کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا کہ **ان اقیموا الدین** (دین کو قائم کرو) یعنی دین بالفعل نافذ ہو۔ دین (اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ)۔ کے مطابق تمام معاملات طے ہوں، تمام امور کا تصفیہ کیا جائے، کسی کام کو حرام وحلال، جائز وناجائز قرار دینے کا اللہ کو کامل مختار ومجاز تسلیم کیا جائے۔ اس سے سر مو انحراف نہ کیا جائے۔ جب تک امر واقعہ میں یہ صورت حال عملاً نافذ نہیں ہوتی اس وقت تک دین کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہوتا جو انزال وحی، ارسال کتب اور بعثت انبیاء ورسل کا بنیادی واساسی مقصد ہے۔ (مطالبات دین ص 94)

اور امر واقعہ میں یہ صورت حال عملاً اس وقت نافذ سمجھی جائے گی جب کسی علاقہ میں اسلامی نظام پر مبنی اسلامی حکومت قائم ہو جائے جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

''تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن من دھن سے کوشاں ہو، اس کے لئے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں۔ تکبیر رب، اقامت دین، اظہار دین الحق علی الدین کلہ اور حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ **لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا** اور......

تین عام فہم تعبیرات ہیں۔ قیام حکومت الٰہیہ، نفاذ نظام اسلامی اور اسلامی انقلاب''۔ (ص 109 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

## جواب

ڈاکٹر اسرار صاحب نے جس آیت سے استدلال کیا ہے ان کے بقول اس میں پانچ اولوالعزم پیغمبروں کو اقامت دین کا حکم ہوا۔ بالفاظ دیگر ان کو حکومتی سطح پر اسلامی انقلاب برپا کرنے اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا حکم ہوا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی جانب سے حکومت قائم کرنے کی کوئی بھی کوشش منقول نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں سے صرف چند افراد مسلمان ہوئے ان کے اپنے گھر والوں میں سے بعض افراد کفر پر قائم رہے۔ وہ اپنی کوشش سے حکومت الٰہیہ قائم نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے کافر قوم کو غرق کر دیا پھر جو چند مسلمان تھے ان کی تعداد ہی اتنی قلیل تھی کہ کسی حکومت کی تشکیل کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی میدان تیہ میں وفات ہوئی۔ نہ کوئی شہر تھا نہ ملک تھا حکومت الٰہیہ کیا قائم ہوتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے چند لوگ تھے۔ یہود جان کے دشمن بن گئے تو آپ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا

گیا۔ایسے میں اسلامی حکومت وریاست قائم کرنے کی کوشش کیسے متصور ہوسکتی ہے۔

مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل نبی ﷺ اور صحابہ کی جانب سے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوئی شعوری اور بلاواسطہ محنت مفقود ہے۔مشرکین مکہ جب جان کے درپے ہوگئے تو مجبوراً ہجرت کرنا پڑی۔ مدینہ منورہ میں حکومت الٰہیہ قائم ہوئی تو وہ محض عطیہ خداوندی تھی۔

ہماری اس بات پر اکثر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ حکومت قائم کرنے کے لئے کوشش تو ابتداء ہی سے کرنی ہوگی۔اس سے تو ہمیں انکار نہیں لیکن جب حکم تو یہ ہو کہ دین بالفعل نافذ ہو یعنی بالفعل حکومت الٰہیہ قائم کرو تو معاملہ اگر ابتدائی تبلیغ پر رک جائے اور حکومت بالفعل قائم نہ ہو تو اس کو حکم پورا کرنا نہیں کہتے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب بھی مجبور ہو کر یہی عذر بتاتے ہیں لہٰذا لکھتے ہیں:
''قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ (حضرت نوح علیہ السلام) پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے۔اس میں بھی ایک بیٹے نے دعوت حق قبول نہیں کی تھی وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ممکن ہے کہ چند انگلیوں پر گنے جانے والے اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں۔بہرحال ساتھی نہ ملے، جمعیت فراہم نہیں ہوئی، اگلا قدم کیسے اٹھتا۔اعوان وانصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو۔لیکن نوح علیہ السلام کی استقامت ومصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت وتبلیغ میں لگا دیئے اور کھپا دیئے اور اپنے فرض منصبی کو ادا کر دیا''۔(ص 197 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عام عقل والا شخص بھی اس کو تسلیم نہیں کرے گا کہ حکم تو دیا گیا ہو ایک نظام برپا کرنے کا تاکہ عبادت اور شہادت حق علی الناس بکمالہ ادا ہوسکیں اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو پورا بھی نہ کر پائیں پھر بھی وہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے والے کہلائیں۔کتنے ہی لوگ ہیں جو محض اجتماعی نظام کی برکتوں کے مشاہدہ سے ہی متاثر ہوتے ہیں ان کو

یہ موقع بھی فراہم نہ ہوا، اور ڈاکٹر صاحب کے اپنے فلسفہ کے علی الرغم باوجود اس کے کہ عبادت بھی ناقص کی، شہادت حق بھی پورا نہیں کیا اور نظام اسلامی برپا کرنا تو بہت ہی دور رہا، لیکن پھر بھی **اقیموا الدین** پر پورا عمل ہو گیا اور فرض منصبی بکمالہ ادا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ایسی ناقص سمجھ سے محفوظ رکھیں۔

جب ڈاکٹر اسرار صاحب کے بتائے ہوئے معنی درست ثابت نہیں ہوئے تو اب ہم درست معنی نقل کرتے ہیں۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

**یجب ان یکون المراد من هذا الدین شیئا مغایرا للتکالیف والا حکام و ذلک لا نها مختلفة متفاوتة قال اللہ تعالیٰ لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا فیجب ان یکون المراد منه الامور التی لا تختلف باختلاف الشرائع وهی الایمان باللہ تعالیٰ و ملائکته و کتبه و رسله والیوم الاخر، والایمان یوجب الاعراض عن الدنیا والا قبال علی الاخرة السعی فی مکارم الاخلاق والاحتراز عن رزائل الاحوال۔** (ص 156، ج 27)

''واجب ہے کہ اس دین سے مراد ایسی شئی ہو جو تکالیف و احکام کی غیر ہو، کیونکہ تکالیف و احکام مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''**لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا**'' پس واجب ہے کہ اس سے مراد وہ امور ہوں جو شریعتوں کے اختلاف سے نہیں بدلتے اور یہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان۔ اور ایمان دنیا سے اعراض اور آخرت کی طرف توجہ اور مکارم اخلاق کے لئے کوشش اور رذیل حالات سے بچنے کا موجب ہے''۔

روح المعانی میں ہے:

**لم یبعث نبی الا امر باقامة الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة والا قرار باللّٰہ تعالیٰ وطاعة سبحانه و ذلک اقامة الدین۔**

''کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا مگر یہ کہ اس کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے اور اللہ تعالیٰ کو ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا اور یہی اقامت دین ہے''۔

نیز روح المعانی میں ہے۔

**ای دین الاسلام الذی ھو توحید اللہ تعالیٰ و طاعتہ والایمان بکتبہ و رسلہ و بیوم الجزاء وسائر مایکون العبدبہ مومنا والمراد باقامتہ تعدیل ارکانہ و حفظہ من ان یقع فیہ زیغ و المواظبۃ علیہ۔**

''یعنی دین اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت ہے اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم جزا اور وہ تمام باتیں جن سے ایک بندہ مومن بنتا ہے ان پر ایمان لانا ہے۔ اور دین کی اقامت سے مراد اس کے ارکان کی اچھے طریقے سے پابندی ہے اور دین کی اس بات سے حفاظت کرنا ہے کہ اس میں کوئی کجی واقع ہو اور اسی پر ہمیشگی کرنا ہے''۔

حضرت مجاہدؒ، امام رازیؒ اور علامہ آلوسیؒ تو اس دور کے لوگ ہیں جب اسلامی حکومتیں نہ صرف قائم تھیں بلکہ ان کا بڑا رعب اور دبدبہ بھی تھا لیکن یہ لوگ دین کا وہ اصطلاحی معنی نہیں بتاتے جو مودودی صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب بیان کرتے ہیں اور اقامت دین سے وہ مراد نہیں لیتے جو مودودی صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب مراد لیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار صاحب کہیں کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن پاک میں **ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ**'' کی آیت تین مرتبہ وارد ہوئی ہے۔ اس سے اس کے بنیادی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور اس آیت میں غلبہ دین ہی کی تو بات ہے اور اس آیت کا ترجمہ یہی تو ہے۔

﴿وہی ہے اللہ وہ ذات بابرکت جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق دے کر﴾ کتاب بھی دی اور نظام زندگی یعنی شریعت بھی، احکام بھی دیئے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کے ضابطے بھی دیئے۔ صحیح و غلط کے معیارات بھی قائم کئے تاکہ حضورؐ اس ہدایت اور دین حق کو ہر جنس دین پر غالب کر دیں'' (ص 88 مطالبات دین)

اپنی کتاب منتخب نصاب میں تحریر کرتے ہیں۔

''خود سورہ صف کا عمود اس کی آیت نمبر 9 سے معین ہوتا ہے یعنی اظہار دین الحق علی الدین کلمہ یا اللہ کے دین حق کو کل

کے کل دین یا نظام زندگی پر غالب و نافذ کرنا، جس سے بیک وقت دین کے فلسفہ وحکمت کے تین اہم اور بنیادی مضامین کی وضاحت کی ہے۔

اولاً اس سے الجہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل، مقصود یا غایت قصویٰ کا تعین ہوتا ہے۔ ثانیاً اس سے مطالبات دین کے ضمن میں بھی مرتبہ تکمیل کا تعین ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عبادت رب کا حق بھی اس وقت تک کاملۃً ادا نہیں ہوسکتا جب تک اللہ کا دین پورے نظام زندگی پر غالب نہ ہو، اس لئے کہ اس صورت میں اللہ کی اطاعت صرف انفرادی زندگی میں کی جا سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے وہ گوشے اس سے خالی رہ جائیں گے جو اجتماعی نظام کے زیر تسلط ہوتے ہیں......الخ۔

ثالثاً اس سے نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کی امتیازی یا اتمامی وتکمیلی شان بھی واضح ہوتی ہے، مختصراً یہ کہ:

(1) آنحضورؐ دو چیزوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دوسرے دین الحق یعنی اطاعت خداوندی کے اصل الاصول پر مبنی انسانی زندگی کا مکمل اور متوازن نظام عدل وقسط۔

(2) آپ کے مقصد بعثت میں جہاں انذار وتبشیر، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفوس اور تصفیہ قلوب ایسے اساسی و بنیادی امور بھی لامحالہ شامل ہیں جو بعثت انبیاء ورسل کی اصل غرض وغایت ہیں وہاں دین حق کی شہادت واقامت کا اتمامی وتکمیلی مرحلہ بھی شامل ہے اور یہی آپؐ کے مقصد بعثت کی امتیازی شان ہے''۔ (ص 93, 94 منتخب نصاب)

اور یہی بتانے کے لئے کہ اظہار دین الحق علی الدین کلہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء کا حوالہ اپنی کتاب جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی میں دیا ہے۔

## جواب

ڈاکٹر صاحب نے آیت ''**هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ**''. میں ''**لیظھر**'' کا فاعل رسول کو بنایا ہے اور ضمیر منصوب متصل کا مرجع الہدیٰ و دین الحق کو قرار دیا ہے۔

روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

**ھوالذی ارسل رسولہ ﴿محمدا ﷺ﴾ متلبسا بالھدی ای القرآن الذی ھو ھدی للمتقین و دین الحق ای الثابت و قیل، دینہ تعالیٰ و ھو دین الاسلام لیظھرہ ﴿ای الرسول﴾علی الدین کلہ ای علیٰ اھل الادیان کلھا فیخذ لھم او لیظھرہ ﴿دین الحق﴾ علی سائر الادیان لنسخہ ایاھا حسبما تقتضیہ الحکمۃ فال فی الدین سواء کان الضمیر للرسول ﷺ ام للدین الحق للاستغراق والجملۃ بیان و تقریر لمضمون الجملۃ السابقۃ لان مآل الاتمام ھو الاظھار.**

وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول محمد ﷺ کو ہدایت یعنی قرآن جو کہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور دین حق یعنی ثابت شدہ دین کے ساتھ بھیجا اور کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا دین جو کہ دین اسلام ہے تا کہ غالب کرے اس (یعنی رسول اللہ ﷺ کو تمام ادیان پر۔ یعنی تمام ادیان والوں پر غالب کر دے اور ان (اہل ادیان) کو رسوا کرے یا دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کرے اس دین کے ان کو منسوخ کرنے کے ساتھ حکمت کے تقاضے کے مطابق۔ پس الدین کا الف لام استغراق کے لئے ہے خواہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کے لئے ہو یا دین حق کے لئے ہو۔ اور (یہ) جملہ گزشتہ جملہ کے مضمون کی وضاحت و بیان ہے کیونکہ اتمام کا نتیجہ بھی غالب کرنا ہی ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے:۔

**والضمیر لیظھرہ للدین الحق اوللرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام**

اور ''**لیظھرہ**'' میں ضمیر یا تو دین حق کے لئے ہے یا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ازالۃ الخفاء کی جو عبارت نقل کی ہے خود اس میں ہے:۔

''الفاظ قرآنی بھی اس کو نہیں چاہتے کہ حضرت ﷺ کی حیات ہی میں دین حق کو غلبہ کامل ہو جائے۔ چنانچہ اگر **لیظھرہ** کی ضمیر (منصوب متصل) ہدیٰ اور دین حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا اس ہدایت اور دین حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہو جائے۔ آپ ﷺ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا گو تتمہ اس غلبہ کا آنجناب ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا۔

اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ دین حق کا غلبہ جو آنحضرت ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ سے ہوا، بلاشبہ وہ آنحضرت ﷺ علیہ وسلم ہی کا غالب ہونا ہے''۔(ص 629 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

**لیظهره** میں ضمیر منصوب متصل سے رسول مراد ہونے کی صورت میں **لیظهره** کا فاعل اللہ تعالیٰ کے ہونے میں تو کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ضمیر منصوب متصل سے اگر دین حق مراد ہو تو نحوی اعتبار سے احتمال ہے کہ **لیظهره** کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوں یا رسول اللہ ﷺ ہوں۔اس میں بھی یہ متعین ہے کہ **لیظهره** کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوں، کیونکہ:

عام مفسرین نے ضمیر منصوب متصل کے مرجع میں تو اختلاف ذکر کیا ہے۔**لیظهره** کے فاعل میں اختلاف ذکر نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مولانا تھانویؒ نے اپنے ترجمہ میں **لیظهره** کا فاعل اللہ تعالیٰ کے ہونے کی تصریح کی ہے۔اور شاہ ولی اللہؒ کی عبارت میں بھی یہ ذکر ہے''۔آپ ﷺ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا'' معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت غلبہ اسلام کا سبب بنی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کو سبب بنا کر اسلام کو کل ادیان پر غلبہ دے دیا۔نیز اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ **لیظهره** کا فاعل رسول اللہ ﷺ ہیں تو یہ بات بدیہی ہے کہ یہ نسبت مجازی ہوگی کیونکہ غالب کر دینے کا حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہیں۔نیز جب نسبت حقیقی ممکن ہو تو مجازی مراد لینا غیر روا ہوگا۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کرنا اللہ تعالیٰ کا اپنا فعل تھا۔رسول اللہ ﷺ کو یہ مشن یا بنیادی واساسی مقاصد نہیں دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ بذات خود دین حق کو دیگر ادیان پر غالب کریں۔البتہ اس سے انکار نہیں کہ غلبہ کی تحصیل کے عادی اسباب کو مختلف مراحل پر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن کسی سمجھ دار مسلم پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ غلبہ کے اسباب کو اختیار کرنا اور بات ہے اور غلبہ حاصل کر لینا اور امر ہے بلکہ مسلمانوں کی اولین تاریخ اس پر شاہد ہے کہ غلبہ کے عادی اسباب بھی پورے طور پر مہیا نہ تھے اور غلبہ کا حاصل ہو جانا محض اللہ کا امر تھا۔

# باب: 8

## ڈاکٹر اسرار صاحب کا تصور عبادت

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی تخلیق کی غایت کھلے کھلے انداز میں یہ بیان فرمائی کہ وہ میری عبادت کریں۔فرمایا: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (سورہ ذاریات)

﴿اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں﴾۔

اسی وجہ سے قرآن پاک میں جا بجا عبادت کا حکم دیا گیا۔فرمایا:

﴿اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ﴾۔(سورہ بقرہ:21)

**وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰه مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (سورہ بینہ)

﴿اوران (یعنی اہل کتاب) کو حکم یہی ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے دین کو﴾۔

جو ذات انتہائی درجے کی عظمت والی ہو اس کے سامنے دلی محبت کے ساتھ انتہائی درجے کی تواضع اور ذلت اختیار کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔

امام راغب رحمہ اللہ اپنی مفردات میں لکھتے ہیں **العبادۃ غایۃ التذلل و لا یستحقھا الا من له غایۃ الافضال و ھو اللہ تعالیٰ** یعنی عبادت انتہائی درجہ کی تذلل و عاجزی کا نام ہے اور اس کا مستحق صرف وہ ہے جو انتہائی درجہ کے فضل و کمال والا ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں **العبادۃ اقصیٰ غایۃ الخضوع و التذلل** یعنی عبادت انتہائی درجہ کی پستی و عاجزی اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔اس کی صورتیں یہ ہیں کہ آدمی اس کی خوشی اوراس کی تعظیم کی خاطر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے اوراپنے آپ کو خوب جھکا دے یہاں تک کہ اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دے۔اس کے لئے کھانا پینا چھوڑ دے۔اس کے نام پر اپنا عزیز مال خرچ کرے۔اس کے لئے مخصوص ہیئت اختیار کر کے اور نفس کے تقاضوں کو ترک کر کے سفر کرے اوراس کے گھر کے گرد دیوانہ وار چکر لگائے۔

اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دے اوراپنا خون زمین پر بہا دے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام بھی ہیں لہٰذا ان کو پورا کرنا اطاعت بھی ہے لیکن ایسی اطاعت جس میں انتہائی درجے کی عاجزی اور تذلل ظاہر ہے۔دوسرے لفظوں میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد عبادت کے وہ کام ہیں جن کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادت کی احسن اور علی وجہ الاتم ادائیگی چونکہ اس وقت ہوسکتی ہے جب دل محبت اور تعظیم کے جذبے سے بھرا ہوا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو ذہنی وقلبی فراغت اور یکسوئی حاصل ہو۔یہ یکسوئی اس وقت ممکن ہے جب آدمی کی ایک تو بنیادی ضروریات پوری ہورہی ہوں اور دوسرے وہ آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے امن میں ہو۔اللہ تعالیٰ نے جہاں بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے لئے مسلمانوں کے افراد اور مسلمانوں کی اجتماعیت وحکومت کو احکام دیئے ہیں وہیں آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے بچنے کے لئے آپس کے معاملات کے بارے میں احکام اور ہدایات عطا فرمائیں۔ ان احکام کا بنیادی نکتہ ہی یہی ہے کہ آپس کے جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ہماری اس گزارش سے یہ بات حاصل ہوئی کہ مسلمان کی زندگی میں عبادت کو اصل کا مقام حاصل ہے اور معاملات کے احکام اس غرض سے ہیں کہ وہ عبادات جو کہ تخلیق کی غرض وغایت ہے اس کی ادائیگی میں یہ مدد ومعاون ہیں۔

## قرآن وسنت میں ارکان اربعہ کے لئے لفظ عبادت کا استعمال

(1) یہ کہنا کہ قرآن وسنت میں نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کو کہیں عبادات نہیں کہا گیا درست نہیں، دیکھئے مندرجہ ذیل آیات واحادیث۔

**وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔** (سورہ مومن: 60)

﴿اور کہتا ہے تمہارا رب مجھ کو پکارو میں قبول کروں گا تمہاری پکار کو۔ بے شک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے وہ داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل ہوکر﴾۔

اس آیت کریمہ میں دعا کو عبادت کہا گیا ہے۔

**عن عطاء قلت لعائشة اخبرینی باعجب مارایت من رسول الله ﷺ قالت ای شانه لم یکن عجبا اتانی الليلة فدخل معی فی لحافی ثم قال ذرینی اعبد ربی فقام فتوضا ثم قام لیصلی۔ (ابن حبان۔ کتاب اخلاق رسول الله ﷺ)**

''عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے آپ رسول اللہ ﷺ کی سب سے عجیب بات بتائیے جو آپ نے دیکھی ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ کی کون سی بات عجیب نہ تھی۔ آپ ﷺ ایک رات میرے پاس آئے اور میرے ساتھ میرے لحاف میں داخل ہو گئے پھر فرمایا مجھے چھوڑ کہ میں اپنے رب کی عبادت کروں۔ پھر اٹھے، وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے''۔

**3- عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى ازواج النبی ﷺ یسألون عن عبادة النبی ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا این نحن من النبی ﷺ وقد غفر الله ماتقدم من ذنبه و ما تأخر۔**

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تین آدمی نبی ﷺ کی ازواج کے پاس گھر میں نبی ﷺ کی عبادت کا معمول معلوم کرنے آئے۔ جب ان کو بتایا گیا (کہ آپ ﷺ اتنی نماز پڑھتے ہیں اور اتنی تلاوت کرتے ہیں اور اتنے روزے رکھتے ہیں) تو انہوں نے اس کو کچھ کم سمجھا......''

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا۔

**یَا ابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِی اَمْلَأْ صَدْرَکَ غِنَی و اَسُدُّ فَقْرَکَ وَالَّا تَفْعَلْ مَلَاتْ یَدَکَ شُغْلَاً وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَکَ۔**

''اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھ کو (دنیوی) مشاغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند نہیں کروں گا''۔

جب دنیوی مشاغل بھی عبادت ہی ہیں تو پھر یہ کہنا کہ تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا یعنی اپنے کچھ اوقات اس کے لئے فارغ کر لے بے معنی سی بات ہے حالانکہ حدیث کی بات بے معنی نہیں ہو سکتی۔

5- ایک اور حدیث میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

**سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلَّه، اِمَامٌ عَادِلٌ و شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ ...... الخ**

''سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے جس دن ان کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا (ایک) عادل حکمران (دوسرا) وہ جوان جس نے اللہ کی عبادت ہی میں پرورش پائی ہو''۔

مذکورہ بالا نصوص کی وجہ سے امت کے سب خاص و عام عبادت کا وہی مفہوم سمجھتے رہے جو امام راغب اور علامہ بیضاوی کے حوالہ سے اوپر نقل ہوا۔ مزید بریں۔

1- امام ترمذی نے اپنی کتاب شمائل ترمذی میں ایک عنوان باندھا ہے **باب ماجاء فی عبادة النبی ﷺ** اور اس عنوان کے تحت وہ روایتیں جمع کی ہیں جن میں آپ کی نماز وغیرہ کا ذکر ہے۔

2- علامہ ابن قیم نے زادالمعاد میں ہدیہ ﷺ فی العبادات کے عنوان کے تحت مروجہ عبادات کو ذکر کیا ہے۔

3- شاہ اسماعیل شہید تقویت الایمان میں شرک فی العبادۃ کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں۔ ''بعضے کام تعظیم کے اللہ نے اپنے واسطے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ و رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں۔

4- امام غزالی اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھتے ہیں ۔

**وقد اسسته علی اربعة ارباع و ھی ربع العبادات و ربع العادات و ربع المھلکات و ربع المنجیات** ( میں نے اس کتاب کے چار حصے کئے ہیں یعنی عبادات ، عادات ، مہلک باتیں اور نجات دینے والی باتیں اور عبادات کے تحت جو دس عنوان لائے ہیں وہ یہ ہیں کتاب العلم ، کتاب قواعد عقائد ، کتاب اسرار طہارت ، کتاب اسرار نماز ، کتاب اسرار زکوۃ ، کتاب اسرار روزہ ، کتاب اسرار حج ، کتاب آداب تلاوت قرآن ، کتاب اذکار وادعیہ ، کتاب ترتیب اوقات ۔

ڈاکٹر اسرار صاحب مودودی صاحب کے اتباع میں عبادت کا کچھ اور ہی مطلب بتاتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ۔ اس کے لئے مذکورہ بالا نصوص کے باوجود اول تو انہوں نے قرآن وسنت میں نماز ، روزے وغیرہ کو عبادت کہنے ہی کی نفی کر دی ۔ لکھتے ہیں :

''عملی ستون چار ہیں نماز ، زکوۃ ، حج اور رمضان کے روزے ۔ ان ہی کو ہم عبادات کہہ دیتے ہیں ۔ اگر چہ پورے قرآن مجید میں ان کے لئے لفظ عبادت کہیں نہیں آیا ، عبادت کا لفظ اسی مفہوم میں ہے جس کی میں نے تشریح کی ہے'' (ص 14)

حالانکہ ان کے لئے کتاب وسنت میں کہیں بھی عبادات کا لفظ استعمال نہیں ہوا ، حدیث میں ان کو ارکان اسلام کہا گیا ہے عبادات نہیں ( میثاق جون 83ء )

اور عبادت کا جو تصور پوری امت میں رہا ہے اس کو وہ محدود بلکہ مسخ شدہ تصور کہتے ہیں ۔

(2) نماز کو ہم عبادت سمجھتے ہیں ۔ روزہ عبادت ہے ۔ زکوۃ عبادت ہے ۔ حج عبادت ہے ۔ بلا شبہ یہ عبادات ہیں ۔ لیکن جب عبادت کو ان میں منحصر کر لیا جائے گا اور جب یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا تو تصور دین محدود ہی نہیں بلکہ مسخ ہو جائے گا'' (ص 18 مطالبات دین )

ڈاکٹر اسرار صاحب کے نزدیک ارکان اربعہ اصل عبادت کے لئے مددگار ہیں خود اصل عبادت نہیں ۔ لکھتے ہیں

''عبادت نماز، روزہ، زکوۃ اور حج میں محدود ومنحصر نہیں بلکہ جیسا کہ میں بعد میں عرض کروں گا یہ وہ اعمال ہیں جو پوری زندگی کو خدا کی بندگی اور غلامی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتے ہیں۔ یہ چیزیں حقیقی عبادت کی ادائیگی میں ممدو معاون بنتی ہیں ان کے ذریعے سے انسان میں وہ قوتیں پیدا ہوتی ہیں جو اس عظیم عبادت کے حقوق کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کو اگر انسان اپنی زندگی میں قائم کرلے تب اس کے لئے آسان ہوگا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس روش کو اختیار کرلے۔جس کا نام عبادت ہے۔'' (ص 19 مطالبات دین)

3- ''اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ محدود تصور ہے اور جو ہمارے ہاں سب سے زیادہ عام ہے اور جو عوام الناس کے ذہنوں میں صدیوں کے انحطاط کے بعد پوری طرح راسخ ہوگیا ہے وہ یہی ہے کہ عبادت سے مراد نماز، روزہ، زکوۃ اور حج ہے اور بس یہ ہیں عبادات باقی زندگی عبادت سے خارج ہے''۔ (ص 22 مطالبات دین)۔

اس سے ذرا وسیع تصور جو پیدا ہوا ہے اور خوش قسمتی سے اس دور میں بہت سے اہل قلم کی کاوشوں، کوششوں کے نتیجے میں اب یہ بات ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کی اچھی خاصی تعداد کے سامنے واضح ہوچکی ہے کہ عبادت پوری زندگی میں کامل اطاعت کا نام ہے (ص 19 مطالبات دین)۔

ڈاکٹر صاحب نے جن بہت سے اہل قلم کا ذکر کیا ہے ان میں سرفہرست جناب مودودی صاحب ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

مولانا مرحوم (مودودی صاحب) میرے والد کی عمر کے تھے۔ پھر میرے محسن بھی تھے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا''۔ (میثاق ستمبر 84ء ص 28)۔

دیکھئے مودودی صاحب تفہیمات جلد اول میں رقم طراز ہیں:۔

’’غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ عبادت صرف تسبیح و مصلیٰ اور مسجد و خانقاہ تک محدود ہے۔ مومن صالح صرف اسی وقت تک عبادت گزار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور بارہ مہینوں میں ایک مہینے کے روزے رکھتا ہے اور سال میں ایک وقت زکوۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک بار حج کرتا ہے بلکہ درحقیقت اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے۔

جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا۔ جب وہ معاملات میں ظلم و جھوٹ اور فریب اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں ہے۔ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو کام بھی کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے‘‘۔ (ص 67 طبع جدید)

نیز لکھتے ہیں:

’’افسوس کہ عبادت کے اس صحیح اور حقیقی مفہوم کو مسلمان بھول گئے۔ انہوں نے چند مخصوص اعمال کا نام عبادت رکھ لیا اور سمجھے کہ بس انہی اعمال کو انجام دینا عبادت ہے اور انہی کو انجام دے کر عبادت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس عظیم الشان غلط فہمی نے عوام و خاص دونوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے‘‘۔ (ص 71 طبع جدید)

اندازہ کیجئے کہ عبادت قرآن کی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ امت قرآن کی بنیادی اصطلاحات کا مطلب ہی بھول جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں موجود ہیں، صحابہ کے اقوال موجود ہیں، قدیم سے قدیم تفاسیر موجود ہیں، حکمائے امت کی کتابیں موجود ہیں پھر ایک ایسی اصطلاح جس کا تعلق ان حضرات کے بقول زندگی کے ہر ہر لمحہ سے ہے اور ہر ہر لمحہ کی اطاعت و تابعداری سے ہے امت کے عوام و خواص سب ہی اس کے بارے میں دھوکہ اور عظیم الشان غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں عجیب حیرت انگیز دعوی ہے جس کی دلیل بس خوش

کن لفاظی ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے اپنے دعوے پر ایک دلیل دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''**وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰه مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکوٰۃَ وَ ذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ ﴿سوره بینه﴾**

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم علیحدہ ہے اور اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوۃ کا حکم علیحدہ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان فرض عبادات سے علیحدہ ایک عبادت انسان سے مطلوب ہے۔ اس عبادت کو **مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ** میں واضح کردیا گیا ہے کہ یہ عبادت اس رویہ اور طرز عمل کا نام ہے کہ انسان یکسو ہو کر مخلصانہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے......الخ''

ڈاکٹر صاحب کی یہ دلیل اپنے دعوے پر قطعی نہیں ہے کیونکہ احتمال ہے کہ یہاں خاص کا عطف عام پر ہو اور یہ ضابطہ ہے کہ جب دوسری بات کا احتمال موجود ہو تو استدلال باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں یہاں **لیعبدوا** کے لئے عبادت کا معنی ہونا کونسا ضروری ہے یہ باب کرم یکرم سے ہوسکتا ہے جس کا مصدر عبودۃ وعبودیت ہے اور معنی غلامی کا ہے (دیکھئے مصباح اللغات)۔

**تنبیه:**

آگے ہم دو باتوں پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

1- اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری ایک مستقل حکم ہے اس کے لئے ہم عبادت کی اصطلاح نہ بھی استعمال کریں تب بھی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اپنی جگہ ضروری ہے قرآن پاک میں اس کی واضح صراحت موجود ہے۔

**یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً** (سورہ بقرہ: 208)

﴿اے ایمان والو اسلام وتابعداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ﴾۔

**يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔** (سورہ نساء: 59)

﴿اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی﴾۔

جب کامل اطاعت کو بتانے کے لئے مستقل اصطلاح موجود ہے تو اس کی خاطر عبادت کی شرعی اصطلاح کو بدلنے کی کوئی ضرورت ومجبوری بھی نہیں۔

2- خرید وفروخت کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، بیوی سے دل لگی کرنا صحبت کرنا، ورزش کرنا، رشتہ داروں سے ملنا یہ سب باتیں ایسی ہیں جو عام طور پر مباح ہیں کہ ان کے کرنے پر ثواب نہیں اور نہ کرنے پر گناہ نہیں البتہ اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کو شریعت کے موافق کیا ہو خلاف نہ کیا ہو۔ اگر خرید وفروخت کی لیکن ایسے طریقے پر جس سے دین وشریعت کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو تو اس پر گناہ ہوتا ہے۔ غرض دین کے موافق کرنے پر وہ مباح ہے ورنہ ناجائز طریقے کی وجہ سے خرید و فروخت بھی ناجائز کہلائے گی۔

البتہ جب ہم کسی مباح کو جائز طریقے پر کریں گے اور اس کے کرنے میں کسی نیکی کی نیت کرلیں مثلاً کھانا کھاتے ہوئے یہ نیت کرلیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طاعات پر قوت حاصل ہوگی، مال اس نیت سے کمائے کہ آمدنی کو غریبوں کی مدد میں اور دین کی اشاعت میں خرچ کروں گا، ورزش جہاد کی تیاری کی نیت سے کرتا ہے، بیوی سے صحبت عفت و پاکدامنی کے لئے یا نیک اولاد کے حصول کی نیت سے کرتا ہے تو اس نیت کی وجہ سے اس کام میں ثواب ملتا ہے اور چونکہ عبادات ہی وہ کام ہیں جو ثواب کے لئے مقرر ہوئے ہیں تو جب نیک نیتی کی وجہ سے مباح کام پر بھی ثواب ملتا ہے تو اس کو بھی مجازاً عبادت کہہ دیتے ہیں۔

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں۔

''لہٰذا جو شخص اس لئے کھانا کھاتا ہے کہ اس کو علم وعمل پر قوت حاصل ہو اور راہ آخرت پر چلنے کی طاقت میسر ہو اس کا

کھانا کھانا عبادت ہے اور اسی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو ہر چیز پر ثواب ہوتا ہے (یعنی جب کہ وہ اس کو شعور کے ساتھ اچھی نیت سے کرے) یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جو وہ اپنے منہ میں ڈالے یا اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے اور آپ ﷺ نے یہ اس لئے فرمایا کہ ان جیسے سب کاموں سے (کامل اور باشعور) مومن کا مقصد راہ آخرت ہوتی ہے''۔

# باب: 9

## ایک غیر فرض کام کو فرض عین قرار دینا

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

**"وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ"۔**

ہر انسان پر حجت قائم کر دی ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی کم اور کیسی ہی معمولی استعداد کا حامل کیوں نہ ہو۔ فلسفہ و منطق اور علوم و فنون سے کتنا ہی نابلد اور زبان و ادب کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے کتنا ہی ناواقف کیوں نہ ہو وہ قرآن سے تذکر کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی طبع سلیم اور فطرت صحیح ہو اور ان میں ٹیڑھ اور کجی راہ نہ پا چکی ہو اور وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اس کا ایک سادہ مفہوم روانی کے ساتھ سمجھتا چلا جائے......

لیکن تذکر بالقرآن کے لئے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہر حال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہے اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ عربی کی اس قدر تحصیل کہ انسان قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ از خود سمجھ سکے اور تلاوت کرتے ہوئے بغیر متن سے نظر ہٹائے اس کے سرسری مفہوم سے آگاہ ہوتا چلا جائے ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لئے فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔

......اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو کجا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو بی اے ایم اے پاس کیا ہو، ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کئے ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اتنی سی عربی نہ سیکھنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا فہم حاصل کر سکتا۔ حضرات! میں پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا عربی سیکھ کر قرآن کا فہم حاصل کرنے سے باز رہنا اللہ کے کلام کا تمسخر اور استہزاء ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر و توہین ہے اور آپ خود سوچ لیں کہ اپنے اس طرز عمل سے ہم اپنے آپ کو اللہ کی کیسی

شدید باز پرس اور کتنی سخت عقوبت کا مستحق بنا رہے ہیں (مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق ص 35-34)

مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کے اصلاح کرنے کے بعد ڈاکٹر اسرار صاحب کی ایک اور عبارت یوں ہے۔
"لیکن پڑھے لکھے لوگ جنھوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا خاصا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کئے ہوں مادری ہی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر وتوہین اور تمسخر واستہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القران کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے" (خط کشیدہ الفاظ مولانا یوسف بنوری کے بتائے ہوئے ہیں)

اس دوسری عبارت میں ڈاکٹر اسرار صاحب نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو پڑھے لکھے ہوں اور جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا خاصا عرصہ صرف کیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کئے ہوں، مادری ہی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں جب کہ پہلی عبارت جو کے قرآن مجید کے حقوق میں موجود ہے اس میں ہر اس مسلمان کو شامل کیا ہے جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو۔

مولانا بنوری رحمہ اللہ کے الفاظ پر ایک اور نظر ڈالیں ......"اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے" ......الخ مولانا رحمہ اللہ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ یہ سمجھنا بھی صرف عربی سیکھنے سے ہو محض ترجمہ دیکھنا کافی نہ ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ تذکر بالقرآن کے لئے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہرحال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہے محض بے دلیل بات ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ناگزیر تھا تو خاندان ولی اللہ اور پھر شیخ الہند رحمہ اللہ اور دیگر اکابرین کو ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی بلکہ اس طرح سے تو انہوں نے گویا ایک "فرض عین" کے ترک کرانے میں اعانت کی۔ آخر ترجمہ سے استفادہ بھی تو وہی لوگ کریں گے جو کچھ پڑھے لکھے ہوں گے۔

اصل چیز تو قرآن پاک کو سمجھنا ہے۔خواہ وہ عربی اور دیگر علوم ضرور یہ سیکھ کر ہو یا ترجمہ دیکھ کر یا کسی عالم سے ترجمہ کروا کر۔اب اس دور میں دیکھا جائے تو احوط طریقہ کسی عالم سے ترجمہ کروا کر سمجھنا ہے،عربی زبان سیکھ بھی لے تب بھی اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔کیونکہ بات صرف الفاظ کی نہیں ہوتی بلکہ ان الفاظ اوراس کلام کی مراد کو بھی سمجھنا اصل مرحلہ ہوتا ہے۔

اُردو زبان کی کتنی عبارتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام اردو پڑھا لکھا شخص نہیں سمجھ سکتا تو قرآن کی عبارت کو محض عربی کے کچھ بنیادی قواعد سیکھ کر کیسے اطمینان ہوسکتا ہے کہ ہر شخص اس کو اوراس کی مراد کو سمجھ لے گا۔بلکہ یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ کتنے ہی لوگ کچھ عربی کے قواعد سیکھ کر قرآن میں اپنی رائے دینے پر جری ہو جاتے ہیں اور ہمچو ما دیگرے نیست کا نعرہ لگانے لگتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تذکر ہوگا قرآن پاک کے ترجمہ کو سمجھنے سے اور ترجمہ سمجھنے کے متعدد طریقے ہیں۔کسی ایک طریقے میں تذکر کو مقید کر دینا درست نہیں اور جب یہ درست نہیں تو عربی زبان کا بنیادی علم سیکھنا تذکر کے لئے شرط بھی نہیں اور جب شرط نہیں تو فرض عین بھی نہیں۔باقی رہی عربی زبان کی فضیلت تو وہ مسلم ہے۔اور اگر قرآن وحدیث سمجھنے کی غرض سے عربی زبان کی تحصیل کے لئے ترغیب دی جائے تو انتہائی مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ کسی اچھے عالم یا بصورت دیگر کسی معتبر تفسیر کی احتیاج بھی مدنظر رہے۔یہ محض تذکر کے لئے بھی موجودہ دور میں ضروری ہے۔

# باب: 10

## مزارعت کے بارے میں غیر منصفانہ فکر

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:۔

''اس مسئلہ میں فقہاء امت کے درمیان میں اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم کی مزارعت حرام ہے ABSENTEE LANDLORDISM کا ان کی رائے میں اسلام میں کوئی امکان سرے سے موجود نہیں۔ بعض دوسرے فقہاء نے ان احادیث پر غور کرنے کے بعد اس میں استحسان اور مصالح مرسلہ کے اصول کے تحت کچھ گنجائشیں نکالی ہیں اور یہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا، لہٰذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربوٰ کا اطلاق کیا ہے......

ہمارے ہاں مزارعت کی جو شکلیں رائج ہیں اس میں پھر بھی مالک بیج اور بہت سی دوسری چیزوں میں شامل ہوتا ہے۔ یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لئے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں۔ ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ آنکھیں کھول دینے کے قابل ہے۔ مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے'' (اسلام کا معاشی نظام ص 28,27)

''یہ بات قابل توجہ ہے کہ جب ہماری اکثریت امام ابوحنیفہ کی فضیلت بیان کرتی ہے تو ان کو امام اعظم اور سید الفقہاء قرار دیتی ہے اور ان کے بعض فتاویٰ کو درست ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے مگر ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو'' کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتویٰ کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی'' (ایضاً حاشیہ 28)

ڈاکٹر صاحب کی یہ عبارت کئی اعتبار سے قابل اعتراض ہے۔ اول تو ان کا انداز تکلم نہایت غیر منصفانہ ہے بلکہ سوقیانہ

ہے۔ان کے الفاظ تو ملاحظہ فرمائیں۔

(i) چونکہ اس دور کے خاص حالات میں ایک موجود الوقت نظام کو کلیۃً بدلنا ممکن نہ تھا لہٰذا کچھ ناگزیر شرائط کے ساتھ ان کی گنجائش پیدا کی گئی تھی ورنہ نبی ﷺ نے تو مزارعت پر لفظ ربوا کا اطلاق کیا ہے۔

(ii) یہ اس حرام کو حلال بنانے کے لئے کچھ اضافی شرائط عائد کی گئی ہیں ورنہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

(iii) مجھے امام صاحب کی اس رائے سے کاملۃً اتفاق ہے۔

(iv) مگر میٹھا میٹھا ہپ اور کڑ واکڑ واتھو کے مصداق ایسے اہم معاملات پر ان کے فتوے کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

اندازہ کیجئے ڈاکٹر اسرار صاحب کی جانب سے یہ سب کچھ اس اعتراف کے بعد ہے ''میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں مجتہد ہونا تو بہت دور کی بات ہے فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے'' (میثاق 84ء ص 44)

اور فقہ ہی کیا ڈاکٹر اسرار صاحب کو نہ تو اصول فقہ کا پتہ ہے، نہ اصول حدیث کا پتہ ہے، نہ ہی علم حدیث پر ان کو دسترس حاصل ہے، نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ اصول فتاوی کیا ہیں۔ ہاں ان کو اسلاف پر زبان طعن دراز کرنے کا پتہ ہے۔

مزارعت کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں دو رائیں تھیں۔

جہاں ایک طرف امام صاحب رحمہ اللہ کی دلیل **نَھٰی عَنِ الْمُخَابَرَۃِ** جیسی حدیث ہے وہاں دوسرے مجتہدین کی دلیل دوسری بہت سی روایتیں ہیں۔ مشکوٰۃ میں **باب المساقاۃ والمزارعۃ** کے تحت دیکھیں تو یہ احادیث ہیں۔

**عن عبداللّٰہ بن عمر ان رسول اللّٰہ ﷺ دفع الٰی یھود خیبر نخل خیبر وارضھا علی ان یعتملوھا من**

**اموالھم و لرسول اللہ ﷺ شطر ثمرھا ﴿رواہ مسلم﴾**

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کو خیبر کے کھجور کے باغ اور اس کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اپنے مال سے اس پر کام کریں اور رسول اللہ ﷺ کے لئے اس کے پھل کا نصف ہو گا''۔

**وفی روایۃ البخاری ان رسول اللّٰہ ﷺ اعطی خیبر الیھود ان یعملوھا و یزرعوھا ولھم شطر ما یخرج منھا۔**

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے یہود کو خیبر کی زمین عطا کی کہ وہ اس پر کام کریں اور زراعت کریں اور اس کی پیداوار میں سے ان کے لئے نصف ہو گا''۔

**عن عمرو قال قلت لطاؤس لو ترکت المخابرۃ فانھم یزعمون ان النبی ﷺ نھی عنہ قال ای عمرو...... ان اعلمھم اخبرنی یعنی ابن عباس ان النبی ﷺ لم ینُہَ عنہ ولکن قال ان یمنح احد کم اخاہ خیرلہ من ان یاخذ علیہ خرجا معلوما ﴿متفق علیہ﴾**

''عمرو رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس رحمہ اللہ سے کہا کہ کاش آپ مخابرہ ترک کر دیتے کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے انہوں نے (جواباً) کہا اے عمرو مجھ کو خبر دی بڑے عالم یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہ نبی ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا لیکن یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک کا اپنے بھائی پر سخاوت کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اس پر مقررہ خراج لے''۔

اور مزارعت کے جواز کے قائل مجتہدین رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ممانعت کو حدیثوں ہی کی وجہ سے مقید مانتے ہیں۔

**عن حنظلۃ بن قیس عن رافع بن خدیج قال اخبرنی عمای انھم کانوا یکرون الارض علیٰ عھد النبی ﷺ بما ینبت علی الاربعاء اوشیٔ یستثنیہ صاحب الارض فنھانا النبی ﷺ عن ذالک فقلت لرافع فکیف ھی بالدینار والدرھم فقال لیس بھا بأس و کان الذی نھی عن ذالک مالو نظر فیہ ذوو الفھم بالحلال والحرام لم یجیزوہ لمافیہ من المخاطرۃ۔ ﴿متفق علیہ﴾۔**

''حنظلہ بن قیس رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ مجھے میرے دو چچاؤں نے بتایا کہ لوگ نبی ﷺ کے دور میں زمین کو اجرت پر دیتے تھے اس پیداوار کے عوض میں جو نالوں پر ہوتی تھی یا اس کے عوض میں جس کو مالک زمین اپنے لئے خاص کر لیتا تھا تو نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے رافع رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ دراہم و دنانیر کے عوض میں کیسا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ گویا کہ جس سے روکے گئے وہ وہ چیز ہے کہ اگر حلال وحرام کی فہم رکھنے والے اس میں غور کریں تو دھوکہ ہونے کی بنا پر اس کی اجازت نہ دیں''۔

**عن رافع بن خديج قال كنا اكثر اهل المدينة حقلا و كان احدنا يكرى ارضه فيقول هذه القطعة لى و هذه لك فربما اخرجت ذه ولم تخرج ذه فنها هم النبى ﷺ (متفق عليه)**

''رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اکثر اہل مدینہ زراعت کرتے تھے اور ہم میں سے ایک اپنی زمین کرائے پر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ قطعہ (زمین) یعنی اس کی پیداوار میرے لئے ہے اور یہ تیرے لئے ہے۔ تو بسا اوقات اس حصہ میں پیداوار ہوتی اور اس حصہ میں نہ ہوتی تو نبی ﷺ نے اس طرح کے معاملہ سے منع فرمایا''۔

امام ترمذی رحمہ اللہ ''**باب ماجاء فى المزارعة**'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

**والعمل علىٰ هذا عند بعض اهل العلم من اصحٰب النبى ﷺ وغير هم لم يروا بالمزارعة بأسا علٰى النصف والثلث والربع و اختار بعضهم ان يكون البذر من رب الارض و هوقول احمد و اسحاق و كره بعض اهل العلم المزارعة بالثلث و الربع ولم يروا بمساقاة النخيل باسا و هو قول مالك بن انس و الشافعى ولم ير بعضهم ان يصح شىء من المزارعة الاان تستاجر الارض بالذهب والفضة۔**

''نبی ﷺ کے اصحاب میں سے بعض اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ ان کے علاوہ دوسروں نے نصف تہائی، چوتھائی پیداوار پر مزارعت میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ ان میں سے بعض نے اس کو اختیار کیا کہ بیج زمین کے مالک کا ہو اور یہ قول احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راہو یہ کا ہے۔ بعض اہل علم نے مزارعت تہائی اور چوتھائی پر مکروہ سمجھی لیکن تہائی اور چوتھائی پیداوار پر (باغوں میں اسی معاملہ یعنی) مساقات میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ یہ قول مالک بن انس اور شافعی رحمہما اللہ کا ہے

اور بعض کی رائے یہ ہے کہ مزارعت کی کوئی صورت درست نہیں مگر یہ کہ زمین کو سونے یا چاندی کے عوض کرائے پر لے لیا جائے''۔

صاحب مشکوٰۃ ''**باب المساقاۃ والمزارعۃ**'' کی فصل ثالث میں یہ روایت لائے ہیں:

**عن قیس بن مسلم عن ابی جعفر قال ما بالمدینۃ اہل بیت ہجرۃ الا یزرعون علی الثلث و الربع و زارع علی وسعد بن مالک و عبد اللہ بن مسعود و عمر بن عبدالعزیز والقاسم و عروۃ و آل ابی بکر و آل عمر و آل علی و ابن سیرین و قال عبدالرحمٰن بن الاسود کنت اشارک عبدالرحمٰن بن یزید فی الزرع و عامل عمر الناس علیٰ ان جاء عمر بالبذر من عندہ فلہ الشطر و ان جاء وا با لبذر فلھم کذا ﴿رواہ البخاری﴾**

''ابو جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں کوئی بھی ہجرت والا گھر نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے مکین تہائی اور چوتھائی پیداوار پر کاشت کرتے ہیں اور حضرت علی، حضرت سعد بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، آل ابوبکر، آل عمر، آل علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے مزارعت کی، عبدالرحمٰن بن اسود کہتے ہیں کہ میں نے عبدالرحمٰن بن یزید کے ساتھ کاشت میں مشارکت کی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ساتھ معاملہ یعنی مزارعت کی اس شرط کے ساتھ کہ اگر بیج عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہوگا تو ان کو نصف پیداوار ملے گی اور اگر وہ بیج لائیں گے تو ان کے لئے اتنا حصہ ہوگا''۔

ان حوالوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی مزارعت جاری تھی اور وہ اس کو جائز سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بھی ممانعت کا قول آیا لیکن انہوں نے اس کا دوسرا محمل بتایا۔ حالانکہ خلفائے راشدین خصوصاً اور صحابہ اور تابعین عموماً رضوان اللہ علیہم اجمعین تو تاریخ گر اور دنیا کا نقشہ بدلنے والے تھے۔ اگر سب کی یہی رائے ہوتی کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے تو ان کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ اس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے۔ کیا یہ سلف صالحین پر طعن نہ ہو جائے گا کہ باوجود یہ جاننے کے کہ یہ سود اور ربوا ہے انہوں نے رائج الوقت نظام کی بالکلیہ تبدیلی کو ممکن نہ جانتے ہوئے اس کی کچھ گنجائش پیدا کی۔

## ڈاکٹر اسرار صاحب کی قلابازی

ایک طرف ڈاکٹر اسرار صاحب مزارعت کے ربوا ہونے کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے کاملۃ اتفاق کرتے ہی لیکن دوسری طرح خراجی زمین کو مزارعت پر دینے کو جائز سمجھتے ہیں اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ زمین دینے والا ایک فرد نہیں ہے بلکہ ریاست ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس زمین کے مزارع ریاست کے مزارع ہوں گے اور یہ مزارعت موروثی چل سکتی ہے''۔ (میثاق اپریل 85ء)

بھلا بتائیے ایک معاملہ کی حرمت کی وجہ جب معلوم ہوگئی کہ ربوا یعنی سود ہے تو کیا کسی ریاست کو خواہ وہ اسلامی ریاست ہی ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سودی معاملہ کرے۔ دین اسلام میں تو ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

# باب: 11

## بغیر دلیل مضاربت کو ناپسندیدہ کہنا

اسلام کا معاشی نظام ص 26 پر ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

''ایک شخص محنت کر سکتا ہے، دکان چلا سکتا ہے مگر اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے۔ اب یہ دونوں مل کر کام کرتے ہیں ایک کی محنت ہو گی دوسرے کا سرمایہ۔ اس صورت میں محنت اور سرمایہ کا امتزاج وجود میں آئے گا اور اس کا نام مضاربت ہے۔ یہ دین میں جائز تو ہے مگر پسند نہیں جیسے مثلاً طلاق، اگر کسی کے پاس سرمایہ ہی اتنا ہے کہ جس پر خود اس کی معیشت کا دارومدار چل سکتا ہے تو وہ خود دکان لگائے محنت کرے اور رزق حلال کمائے۔

لیکن اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضروریات کے لئے کوئی اور ذریعہ موجود ہے اور وہ فاضل سرمایہ اپنے ایسے بھائی کو دے رہا ہے جو سرمایہ نہ ہونے کے باعث کسی اور کے سرمائے پر کام کرنے پر مجبور ہے لیکن یہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سرمائے کی بنیاد پر اس کی محنت میں حصہ دار بنتا ہے...... الخ''۔

یہاں ڈاکٹر اسرار صاحب نے دو غلطیاں کی ہیں۔

1- مضاربت کی تعریف جو کتب فقہ میں ملتی ہے وہ یوں ہے۔ **عقد الشرکۃ بمال من احد الجانبین والعمل من الجانب الآخر** یعنی ایسا عقد شرکت جس میں ایک جانب سے سرمایہ اور دوسری جانب سے محنت ہو۔ لیکن اس میں ''زائد سرمایہ'' کی کوئی قید نہیں جو کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں موجود ہے اور وہ یہ کہ ''اور کسی دوسرے شخص کے پاس زائد سرمایہ موجود ہے''۔ اب چونکہ یہ قید لگا چکے اس لئے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ کسی کے پاس سرمایہ تو ہو لیکن زائد نہیں تو اس کے بارے میں یہ ہدایت کی کہ ''وہ خود دکان لگائے محنت کرے اور رزق حلال کمائے''۔

اب اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ اگر اس کے پاس اپنی معیشت کے بقدر سرمایہ ہے لیکن وہ دکانداری اور تجارت کے طریقوں سے ناواقف ہے یا مثلاً عورت ہے یا یہ کہ اس کی طبیعت اور ذہن اس میں نہیں چلتا یا مثلاً یہ کہ اس کے پاس وقت نہیں ہے مثلاً وہ طالب علم ہے یا عالم ہے یا بغیر معاوضہ کے تبلیغ کرنا چاہتا ہے یا کم تنخواہ پر ملازم ہے تو پھر کیا کرے؟ ڈاکٹر صاحب نے اس تیسری صورت کے لئے تو گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

اسی بات کو صاحب ہدایہ نے اس طرح ذکر کیا ہے: **وهی مشروعة للحاجة الیها فان الناس بین غنی بالمال غبی عن التصرف فیه و بین مهتد فی التصرف صفرا لید عنه فمست الحاجة الی شرع هذا النوع من التصرف لینتظم مصلحة الغبی والذ کی و الفقیر والغنی۔**

’’یہ حاجت کی بناء پر مشروع ہے کیونکہ لوگوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو مالدار ہوں لیکن مال میں تصرف سے غبی ہوں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو کام کے طریقے خوب جانتے ہیں لیکن خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ تو حاجت اس نوع کے تصرف کی مشروعیت کا باعث ہوئی تا کہ غبی اور ذکی اور فقیر اور غنی کی مصلحت کا انتظام ہو‘‘۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا یہ بھی کوئی شرط ہے کہ صاحب محنت کا اپنا سرے سے کوئی سرمایہ نہ ہو؟ حالانکہ یہ صورت بھی مضاربت کی ممکن ہے کہ محنت والے کا اپنا سرمایہ بھی اسی کام میں لگا ہو۔

## ڈاکٹر صاحب کی دلیل میں غلطی

رہی یہ بات کہ یہ دین میں پسندیدہ نہیں تو دعویٰ بلا دلیل ہے کیونکہ ایسی کتنی ہی صورتیں ہیں جن میں ایک شخص دوسرے کی محنت کے بل بوتے پر خوب کماتا ہے۔ کاروباری اداروں میں اور دکانوں میں ملازمت، اسی طرح کارخانوں میں ملازمت۔ اگر ’’قل العفو‘‘ کے تحت مضاربت ناپسندیدہ ہے تو یہ سب صورتیں بھی ناپسندیدہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ضرورت سے زائد سرمایہ ان ملازمین کو دے دیا جائے تو یہ بھی اپنے طور پر کوئی کاروبار یا دھندا کر کے سرمایہ دار کو نفع میں شریک کرنے پر راضی نہ ہوتے۔

پھر ہدایہ اور اس کی شرح عنایہ میں ہے ﴿وبعث النبی ﷺ﴾ بیان ان ثبوتها بالسنة والاجماع فانه ﷺ بعث ﴿والناس يباشرونه فقررهم﴾ على ماروى ان العباس بن عبدالمطلب كان اذا دفع مضاربة شرط على المضارب ان لا يسلك به بحرا وان لا ينزل به واديا ولا يشترى به ذات كبد رطب فان فعل ذلك ضمن فبلغ رسول الله ﷺ فاستحسنه. وتقرير النبی ﷺ امرا يعاينه من اقسام السنة على ماعلم ﴿وتعاملت به الصحابة﴾ من غير نكير فكان اجماعا.

''یہ بیان ہے کہ مضاربت سنت اور اجماع سے ثابت ہے کیونکہ نبی ﷺ مبعوث فرمائے گئے اس حال میں کہ لوگ اس کا ارتکاب کرتے تھے اور آپ نے ان کی تقریر فرمائی جیسا کہ روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب جب مضاربت کے طور پر مال دیتے تھے تو مضارب پر شرط لگاتے تھے کہ وہ اس کو لے کر سمندری سفر پر نہ جائے کسی وادی میں نہ اترے اور اس سے کسی جاندار کو نہ خریدے اور اگر اس نے ایسا کیا تو ضامن ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات پہنچی تو آپ نے اس کو پسند فرمایا۔ اور نبی ﷺ کی تقریر ایسے امر پر جس کا آپ نے معائنہ کیا ہو سنت کی اقسام میں سے ہے جیسا کہ معلوم ہے اور صحابہ کا بغیر کسی کے انکار کے اس پر تعامل رہا ہے تو یہ اجماع ہوا اور ان صحابہ میں حضرت عمر، عثمان اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم ہیں''۔

اب ایک کام جو نبی ﷺ کے سامنے بلکہ آپ کے چچا کرتے ہوں اور فقہاء صحابہ کرتے ہوں نبی ﷺ نے اس کے غیر پسندیدہ ہونے کی نہ کوئی تصریح کی ہو اور نہ ہی اس کا کوئی اشارہ دیا ہو۔ اور کسی طرف سے نکیر بھی نہ ہو، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ دین میں ناپسندیدہ ہے دین میں ناجائز دخل اندازی ہے۔

# باب:12

## خراجی زمین کے مفہوم سے عدم واقفیت

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں۔

''............وہ یہ فقہ حنفی کی رو سے ہمارے بعض علماء کی نہایت ہی قابل غور اور فکر انگیز رائے یہ ہے کہ پاکستان کی اکثر و بیشتر قابل کاشت اراضی خراجی زمینیں ہیں عشری نہیں ہیں۔خراجی زمین کا مطلب یہ ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے فوجی قوت سے فتح کیا ہو وہاں کی زمینیں انفرادی ملکیت میں نہیں رہتیں بلکہ وہ حکومت کی اجتماعی ملکیت ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے ہو جاتی ہیں۔اگر کسی وقت کوئی دوسری قوم ملک پر قابض ہو جائے لیکن جب مسلمان اسے دوبارہ حاصل کر لیں یا وہ ملک آزاد ہو جائے تو پھر بھی زمین کی حیثیت خراجی رہے گی۔

گویا جو زمینیں ایک مرتبہ خراجی ہو گئیں وہ ہمیشہ خراجی رہیں گی اس زمین کے مزارع ریاست کے مزارع ہوں گے اور یہ مزارعت موروثی چل سکتی ہے۔کوئی زمیندار مالک بن کر ان پر قابض نہیں رہ سکتا۔اب یہ مسئلہ بھی انتہائی غور اور حل طلب ہے اس پر غور وفکر ہونا اور اسلام کی منشاء کے مطابق ہمارے یہاں کے کاشتکاری کے موجودہ نظام کو استوار کرنا لازم ولابدمنہ ہے جس کے بغیر یہاں نہ صحیح طور پر جمہوریت آسکتی ہے اور نہ ہی اسلامی نظام قائم ونافذ ہوسکتا ہے۔اور نہ ہی اس کی برکات سے ہمارا ملک فیض یاب ہوسکتا ہے''۔(میثاق اپریل 85ء ص 15-16)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کو نہ تو مفتوحہ اراضی کے مسئلہ کا علم ہے اور نہ ہی خراجی زمین کے مفہوم سے وہ واقف ہیں۔

یہاں خراجی زمین کی جو تعریف ڈاکٹر اسرار صاحب نے بتائی ہے وہ درست نہیں ہے بلکہ صورت یوں ہے کہ فوجی قوت اور قہر وغلبہ کے ساتھ اگر ملک فتح ہو تو اس صورت میں ملک کی اراضی کے متعلق امام المسلمین کو تین قسم کے اختیارات

حاصل ہوتے ہیں۔

(الف) یہ کہ منقولہ اموال غنیمت کی طرح اراضی کو بھی تقسیم کر دے یعنی پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکال کر باقی چار حصے غانمین جنہوں نے یہ ملک فتح کیا ہے ان میں تقسیم کر دے۔ پانچواں حصہ اراضی بیت المال میں شامل ہو جائے گا اور جو اراضی غانمین میں تقسیم ہو گی ان میں ہر شخص اپنے اپنے حصے کا مالک ہو گا۔ اس کو ہر قسم کے مالکانہ تصرفات بیع و ہبہ و وقف وغیرہ کے مکمل اختیارات ہوں گے اور اس کے انتقال کے بعد یہ زمین ان کے وارثوں میں حسب حصص شرعیہ منتقل ہو گی۔ ان زمینوں پر عشر ہو گا اور یہ عشری زمین کہلاتی ہیں۔

(ب) اراضی مفتوحہ میں سے جو زمینیں لوگوں کی املاک ہیں ان پر ان ہی لوگوں کی ملکیت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی زمینوں پر خراج اور ان پر جزیہ مقرر کر دے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق اور شام اور مصر کی عام اراضی مملوکہ کے ساتھ یہی دستور العمل اختیار فرمایا۔ اس صورت میں اراضی مملوکہ قدیم باشندگان ملک کی ملک میں بدستور قائم رہیں گی۔ نہ غانمین کو ان میں تصرف کا کوئی حق ہو گا نہ بیت المال کا حصہ خمس ان میں سے لیا جائے گا۔ صرف ان زمینوں کا خراج بیت المال کا حق ہو گا۔ یہ زمینیں خراجی کہلاتی ہیں۔

(ج) یہ کہ ان اراضی کو نہ غانمین میں تقسیم کرے اور نہ مالکان سابق کی ملک ان پر قائم رکھے بلکہ ان کو سابقہ مالکان کی ملکیت سے نکال کر ان کی زمینوں کو اراضی بیت المال میں شامل کر دے اور پھر بیت المال کی طرف سے ان کی زراعت و آبادی کا انتظام ہو۔ یہ وقف زمین کہلاتی ہیں۔

بعض فقہاء کی تحقیق مصر و شام و عراق کی زمینوں کے متعلق بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں یہی تیسری قسم کا اختیار نافذ فرمایا تھا اور اسی لئے ان فقہاء کے نزدیک عراق و شام وغیرہ کی اراضی وقف ہیں اور ان کی بیع و شراء جائز نہیں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی لاعلمی دیکھئے کہ وہ اراضی کے خراجی ہونے کا بڑے شد و مد سے بیان دیتے ہیں جب کہ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خراجی زمین تو مملوکہ زمین ہوتی ہے جس کے مالک کو زمین کا ٹیکس جس کو خراج کہتے ہیں دینا پڑتا ہے۔ اگر زمین مملوکہ نہ ہو وقف ہو تو وہ اراضی بیت المال یا اراضیٔ وقف کہلاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے جن بعض علماء کی رائے نقل کی ہے انہوں نے بھی اراضی کو خراجی نہیں کہا بلکہ اراضی بیت المال کہا ہے۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں۔ (اسلام کا اقتصادی نظام ص 401)

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اور حضرت شیخ جلال تھانیسری رحمہ اللہ نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھا اور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملک ہے) بہت سے دلائل وشواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی...... عامۂ مسلمین کے لئے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص وفرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل ہے'' (اسلام کا اقتصادی نظام: ص 402)

# باب: 13

## ڈاکٹر اسرار صاحب کا نیم تقلیدی فلسفہ

ڈاکٹر اسرار صاحب لکھتے ہیں:

''تقلید جامد اور اجتہاد مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہوگا، تقلید جامد سے میری مراد کیا ہے؟ یہ کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے ہیں کہ اس سے ذرا بھی ادھر یا ادھر نہ خود ہوں گے نہ برداشت کریں گے۔ انسان اس معاملہ میں اتنا زود حس اور الرجک ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو وہ یہ سمجھے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے۔ یہ درحقیقت وحدت امت کے لئے سخت نقصان دہ ہے، رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں، میں کہوں گا کہ اتباع رسول علیہ الصلوۃ والسلام کی نیت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کر لیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں......

البتہ ان پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک مبنی بر کتاب وسنت ہیں۔ تاکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔ رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں جو میدان میں آ کر دین کی خدمت کر رہے ہیں جن کے سامنے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے انہیں تو یقیناً اس تقلید جامد سے نکلنا پڑے گا''۔ (ص:367/368)

''......جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں، میں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں البتہ میرا ایک مزاج ہے میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میں مقلد محض نہیں ہوں۔ میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں۔ ان پانچوں دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے۔ ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرے مزاج میری افتاد طبع اور میری احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ آپ کے اس شہر لاہور ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی مشہور علمی درسگاہ اور دارالعلوم کی ایک جید شخصیت عالم دین شیخ الحدیث کی خدمت میں آج سے قریباً ڈھائی سال قبل میں نے حاضر

ہوکر اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں اوران سے عرض کیا کہ اگران میں سے آپ کسی ایسی بات کی نشان دہی فرمادیں جوائمہ اربعہ اورامام بخاری رحمہم اللہ کے دائرے سے باہر کی ہے تو میں ان کو اپنی کتابوں سے حذف کردوں گا۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف حنفیت میں منحصر ہے تو میرا راستہ اور ہے اور آپ کا اور۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ ہم ان سب کو اہل سنت کے ائمہ تسلیم کرتے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ میں ان شاءاللہ ان تمام باتوں سے رجوع کرلوں گا جو امت کے مسلمہ ان پانچ ائمہ عظام کے دائرے سے باہر کی ہوگی۔(ص371)

1- ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے ''ان (پانچوں) دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کوبھی **اقرب الی السنة اور اقرب الی الصواب** سمجھتا ہوں اس کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں''۔

لیجئے چیونٹی کوبھی پر لگ گئے۔ کہاں تو وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ''میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کررہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں مجتہد ہونا تو بہت دور کی بات ہے فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے (میثاق:84ء ص44)

یعنی نہ عالم ہیں نہ فن حدیث پر کچھ عبور ہے، نہ علم فقہ اوراصول فقہ سے کچھ ممارست ہے لیکن اب سبحان اللہ ایسے پر لگ گئے ہیں کہ مجتہدین کے اقوال اوران کے دلائل کو پرکھ سکتے ہیں اوران کے درمیان فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کس کی بات درست ہے اور سنت کے زیادہ قریب ہے۔

2- الحمدللہ مسلمانوں میں چاروں فقہوں کا احترام موجود ہے اور مسلمان سب کو اہلسنت میں سے شمار کرتے ہیں اور بعض مسائل کے اختلاف کے باوجود ان میں یہ تصور سرے سے نہیں ہے کہ میں کوئی اور ہوں اور یہ کوئی اور ہے۔ ہاں ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے جو اپنے آپ کو اہلحدیث کہلواتا ہے اور تقلید کو شرک کہتا ہے۔ اس طبقہ کی وجہ سے

امت کے اندر انتشار پھیلا ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب بھی چونکہ بوجوہ کسی ایک مجتہد کی تقلید کے پابندنہیں رہنا چاہتے اس لئے ان کواس طبقہ کے ساتھ ایک مناسبت اور ہمدردی ہےاس لئے لکھتے ہیں:

''البتہ چونکہ مسالک اربعہ کے پیرؤوں میں سے تو ہمارے یہاں شاید احناف کے سوا شاذ ہی کسی اور مسلک کے لوگ موجود ہوں لیکن اہلسنت کا ایک اور گروہ برصغیر پاک و ہند میں معتد بہ تعداد میں موجود ہے جو غیر مقلد یا اہلحدیث یا سلفی المسلک الغرض مختلف ناموں سے موسوم ہے......اوراگر چہ یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ایک مسلک ہے کوئی معین مذہب نہیں اوراصولی طور پر اس میں کسی معین مجتہد کی تقلید خارج از بحث ہے تاہم اکثر و بیشتر مسائل میں یہ حضرات امام بخاریؒ کے اجتہادات ہی کا اتباع کرتے ہیں چنانچہ کچھ حضرات انہیں طنزاً مقلدین بخاریؒ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔......

اور جیسا کہ میں نے اپنی زیر بحث تقریر میں عرض کیا تھا امام بخاریؒ وہ شخصیت ہیں جن کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث کو جملہ اہلسنت اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔مزید براں اکابر علمائے احناف نے ان کی فقاہت کوخراج تحسین ادا کیا ہے لہٰذا میں نے اپنی ذات کی حدتک نیم تقلید کا جو دائرہ بنایا ہےاس میں ائمہ اربعہ کے ساتھ ساتھ امام بخاریؒ کو بھی شامل کیا ہے۔(میثاق 84ء 29,30)

## نیم تقلید کی وجوہ

1- ڈاکٹر صاحب اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور ہیں۔لکھتے ہیں''میرا ایک مزاج ہے۔میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔میں مقلد محض نہیں ہوں۔میں نیم مقلد ہوں''۔(ص 271 جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی)

2- دعوت الی اللہ کے کام کرنے والے میں کوئی فقہی لیبل چسپاں نہ ہونا چاہئے۔لکھتے ہیں۔

''دعوت اللہ کی طرف ہو۔اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت وکردار عمل صالح کا مظہر ہو۔مزید براں وہ اپنے آپ کو

مسلمان سمجھے مسلمان کہلائے۔ کسی فقہی مسلک کی طرف نہ دعوت ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو'۔ (میثاق اگست 84: ص 27)

ان دو وجھوں میں سے پہلی وجہ تو بے وزن ہے کیونکہ محض کسی کا خاص مزاج ہونا کوئی دلیل نہیں ہے۔ مزاج کو شریعت کے تابع کیا جاتا ہے شریعت کو مزاج کے تابع نہیں کیا جاتا۔ رہی دوسری وجہ تو یہ پہلی سے بھی زیادہ بے وزن ہے۔ امام غزالی پر شافعی ہونے، ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب پر حنبلی ہونے، شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید اور مولانا الیاس پر حنفی ہونے کا لیبل چسپاں تھا لیکن اس سے ان کے کام اور ان کی دعوت کو کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔

غرض ڈاکٹر اسرار صاحب کا نیم تقلیدی فلسفہ اپنی بنیاد اور آثار دونوں کے لحاظ سے بے وزن تو ہے ہی خطرناک بھی ہے۔ اسی سے ڈاکٹر صاحب کے وہ افکار و نظریات پھوٹے ہیں جن کا ذکر ہم نے اس کتاب میں کیا ہے۔

# باب: 14

## ڈاکٹر اسرار صاحب کے منابع فہم قرآن

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اور الحمدللہ کہ ان دروس وخطابات کے ذریعے قرآن کے جس فہم وفکر کی اشاعت ہورہی ہے وہ کسی ایک لکیر کے فقیر یا کنویں کے مینڈک کی مانند نہیں ہے بلکہ اس میں کم از کم چار منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا قران السعداء موجود ہے یعنی:

ایک: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا رسوخ فی العلم۔

دوسرے: ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ وسائنس اور جدید سیاست واقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت

تیسرے: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا جذبہ حرکت وعمل اور تصور جہاد فی سبیل اللہ۔

چوتھے: مولانا حمیدالدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا تعمق وتدبر قرآن کا اسلوب ومنہاج۔ (جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی ص 24)

ڈاکٹر اسرار صاحب کی فکر دیکھئے۔ اگر کوئی شخص صرف مولانا محمود حسن اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر تک محدود رہے تو وہ اس کو لکیر کا فقیر اور کنویں کا مینڈک سمجھتے ہیں۔ اب ان کے فہم قرآن کے دیگر منابع پر بھی نظر ڈال لیجئے:

ڈاکٹر اسرار صاحب نے تصور دین اور تصور عبادت مودودی صاحب ہی سے اخذ کئے ہیں اور ان تصورات کے غلط ہونے کو ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے جو نیم تقلیدی فلسفہ ایجاد کیا ہے اس کی اصل فکر بھی انہوں نے مودودی صاحب سے ہی حاصل کی ہے۔

## ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے افکار

1- ڈاکٹر اسرار صاحب نے نظریہ ارتقاء اور اس کے دلائل کو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب سے حاصل کیا ہے جس کو انہوں نے تفصیل سے اپنی کتاب ''قرآن اور علم جدید'' میں لکھا ہے۔ قرآن و حدیث سے اس کا بطلان ہم ثابت کر چکے ہیں۔

2- **تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ أَلۡفَ سَنَۃٍ۔ ﴿سورہ معارج﴾**

﴿چڑھیں گے اس کی طرف (یعنی پیشی کے لئے حاضر ہوں گے) فرشتے اور لوگوں کی روحیں (قیامت کے) اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے﴾۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اس آیت کا کچھ اور ہی مطلب بتاتے ہیں کہتے ہیں کہ ''یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کا ارتقاء قوانین قدرت کا ارتقاء ہے۔ یہاں ان قوانین قدرت کو ملائکہ کہا گیا ہے کیونکہ ان کے عمل پر ملائکہ مامور ہیں۔ جب زندگی بلند سطحوں کی طرف ارتقاء کرتی ہے تو وہ نئے قوانین کے عمل کی زد میں آ جاتی ہے اور پھر نئے بلند سطحوں کے ملائکہ اس پر مامور ہوتے ہیں۔ یہی فرشتوں کا عروج الی الحق ہے۔ اور یہاں روح سے مراد زندگی ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں موجود ہے اور رفتہ رفتہ ارتقائی مدارج طے کر کے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہی زندگی کا عروج الی الحق ہے۔

اس لئے ڈاکٹر رفیع الدین اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

''اور اس کی طرف وہ قوتیں جو قوانین قدرت کے عمل کو حرکت میں لانے کے لئے مامور ہیں اور زندگی، یہ دونوں چیزیں ارتقاء کرتی ہیں ایسے ایک دور میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوتی ہے''۔ (قرآن اور علم جدید)

3- **وَاِذۡ أَخَذَ رَبُّکَ مِنۡ بَنِیۡ آدَمَ مِنۡ ظُھُوۡرِھِمۡ ذُرِّیَّتَھُمۡ وَ أَشۡھَدَھُمۡ عَلٰی أَنۡفُسِھِمۡ أَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی شَھِدۡنَا۔**

﴿سورہ اعراف: 172﴾

﴿اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب بولے ہاں کیوں نہیں﴾۔(سورہ اعراف 172)

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں۔

''ظاہر ہے کہ ایسا وعدہ جو خدا نے ہمیں بھلا دیا ہے ہمارے لئے باعث حجت نہیں ہوسکتا لیکن ہماری فطرت کے اندر خدا کی عبادت کی خواہش کا موجود ہونا خدا کی ربوبیت کا ایک ایسا اقرار ہے جو انکار میں بدل نہیں سکتا۔

یہ آیت کسی واقعہ کو بیان نہیں کرتی بلکہ ایک واقعہ کی شکل میں فطرت انسانی کے ابدی اور ازلی حقائق کو بیان کرتی ہے''۔(قرآن اور علم جدید)

جس واقعہ کا ہونا حدیث سے ثابت ہے اور قرآن کا ظاہر الفاظ بھی جس کا متقاضی ہے اور پوری امت جس پر متفق رہی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب اس واقعہ کا ہی انکار کر رہے ہیں حالانکہ اگر ہم بھول گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب سے اور اپنے رسولوں کی وساطت سے ہمیں وہ واقعہ یاد دلایا ہے اور انسانی فطرت کے اندر خدا کی عبادت کی خواہش اس واقعہ کے وقوع پر ایک بڑا قرینہ ہے۔

4- حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتوں کے قصہ کے وقوع کا انکار کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں:

''خدا کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ فرشتوں سے اپنے عزائم اور مقاصد کے بارے میں کوئی گفتگو یا مشورہ کرے اور نہ فرشتوں کا یہ مقام ہے کہ وہ خدا پر دبی زبان سے بھی اعتراضات کریں اور پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ فرشتوں کو اپنے اعتراضات میں برسرغلط ثابت کرنے کے لئے ایک ایسے علم میں آدم کے ساتھ ان کے مقابلہ کا امتحان منعقد کرے جو فریقین کو اسی کی طرف سے عطا کیا گیا ہو...... نہ فرشتوں کا سجدہ کرنا زمین پر سر ٹیکنے کے مترادف ہے اور نہ

ابلیس کا انکار سر ٹیکنے سے انکار ہے۔ پھر جنت عالم حقیقی کی چیز ہے عالم مادی کی نہیں''۔(قرآن اور علم جدید)

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ تو ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب قرآن اور علم جدید میں اہلسنت کے بہت سے عقائد کو ترک کر کے فلسفیوں کے سے تصورات کو اختیار کیا ہے۔

## امین احسن اصلاحی صاحب کا تدبر قرآن

ڈاکٹر اسرار صاحب کے فہم قرآن کا ایک منبع امین احسن اصلاحی صاحب کا تدبر قرآن کا اسلوب ومنہاج ہے۔ اس اسلوب ومنہاج کو اصلاحی صاحب کی اپنی تحریر میں پڑھئے اور ہوا کا رخ دیکھئے۔

اسلاف کا طریقہ تفسیر نقل کرنے کے بعد اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے۔ اصلی چیز خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی اپنی توضیحات ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوال صحابہ کا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ کی تشریحات اور صحابہ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں اس میں تفسیر کے لئے اصل الاصول خود قرآن مجید کے الفاظ اور اس کی توضیحات ہی کو قرار دیا گیا ہے کہ **اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا۔** ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید سے صاف نہیں ہورہی تو اس کے لئے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال سے آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنت رسول اور اقوال صحابہ کی رہنمائی ہی سے ہوسکتی ہے......'' یہاں تک تو اصلاحی صاحب اسلاف کے طریقے پر رہے ہیں لیکن اس کے بعد اچانک رخ موڑ دیتے ہیں اور دو طریقوں سے تفسیر میں حدیث وسنت کی اہمیت بھی گھٹا دیتے ہیں۔

## حدیث کی تنقیص کا پہلا طریقہ

''(رہنمائی کی صورت ) یہ ہوگی کہ ایک آیت پر اس کے الفاظ کی روشنی میں پوری طرح غور کیا۔قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں ان کی روشنی میں بھی اس کو اچھی طرح دیکھ لیا۔سیاق وسباق اور عمود ونظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی پوری تشفی نہیں ہوتی ۔الفاظ کچھ چاہتے ہیں لیکن صاف نہیں معلوم ہوتا کیا چاہتے ہیں؟

اب ہم احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی بات پا لیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے۔الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انکار نہیں رہ جاتا۔نظم اور سیاق کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے تو اس بات کو اگر وہ صحیح طریقہ سے منقول ہوگی قبول کرلیں گے۔(مبادی تدبر قرآن 147-145)

یہاں اسلاف کے طریقہ تفسیر اور اصلاحی صاحب کے طریقہ تفسیر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلاف تو حدیث کو اس کے مرتبہ میں قرآن کا شارح اور مفسر سمجھتے ہیں اور جہاں قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ہوسکتی ہو حدیث سے ہوتی ہو وہاں حدیث ہی کو مفسر قرار دیتے ہیں لیکن اصلاحی صاحب حدیث کو قرآن کا شارح اور مفسر نہیں مانتے بلکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جہاں قرآن کی تفسیر فقط قرآن سے کرنے میں کامیابی نہ ہو وہاں وہ قرآن کی تفسیر کرنے میں حدیث سے مدد تو لیں گے لیکن پھر بھی حدیث کو مفسر اور شارح کے طور پر نہیں لیں گے۔

اور یہ مدد بھی اس لئے نہیں کہ حدیث کو تفسیر میں دخل ہے بلکہ محض اس لئے کہ اپنے غور وفکر سے وہ جس نتیجہ تک پہنچے ہیں اور اس کے بارے میں کچھ کھٹک ہے تو وہ کھٹک دور ہو جائے اور اطمینان ہو جائے کہ ان کا غور وفکر صحیح ہے اور صحیح نتیجہ دے رہا ہے۔اس لئے وہ جس حدیث سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس کا احسان نہیں مانتے اور اس کو تفسیر کے طور پر ذکر نہیں کرتے۔

اصلاحی صاحب ایسا کیوں کرتے ہیں۔اس کی وجہ وہ خود لکھتے ہیں۔

''اگران روایات کی تحقیق وتنقید کر کے ان کے اندر جو مغز ہے اس کو الگ بھی کیا جا سکے جب بھی تنہا انہی کو تفسیر میں فیصلہ کن چیز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔اس لئے کہ یہ روایات صحت کے معیار پر پوری اترنے کے بعد بھی ظن کے شائبہ سے پاک نہیں ہوسکتی ہیں۔اس لئے اگر قرآن مجید کی تفسیر میں تنہا انہی کو فیصلہ کن چیز مان لیا جائے تو قرآن مجید کی قطعیت کو نقصان پہنچے گا اور یہ چیز کسی طرح بھی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے شواہد و دلائل کے ساتھ مل کر تو بلا شبہ یہ روایات قرآن مجید کے صحیح مفہوم کی تعیین میں بہت زیادہ مددگار ہوسکتی ہیں لیکن تنہا انہی کی مدد سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا''۔

اصلاحی صاحب نے جس طرح سے کھل کر یہاں حدیث کی تنقیص کی ہے اس کی مزید تفصیل ان کی کتاب مبادی تدبر حدیث میں موجود ہے۔کیا ہی عجیب بات ہے کہ ان کے غور وفکر کو تو قطعیت حاصل ہوا اور حدیث صحیح ہونے کے باوجود بھی تفسیر میں اس وجہ سے قابل اعتبار نہ ٹھہرے کہ وہ ظن کے شائبہ سے پاک نہیں۔اصل بات یہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے نہ تو قطعیت کے معنی کو سمجھا ہے اور نہ ہی حدیث میں ظنیت کے معنی سے انصاف کیا ہے۔اس کے بارے میں ہم نے تفصیل سے اپنی کتاب ''تحفہ اصلاحی'' میں لکھا ہے۔

## حدیث کی تنقیص کا دوسرا طریقہ

''صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی ......صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے۔اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے۔ٹھیک مفہوم متعین کرے۔طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر وشواہد تلاش کرے۔سیاق وسباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے،نظم کے اعتبار سے اس کا موقع ومحل دیکھے۔عمود کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک وشبہات وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ صحیح روایات پر نگاہ رکھے۔ضعیف اور کمزور روایات کو جن سے کتب تفسیر بھری ہوئی ہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ان شاء اللہ صحیح روایات سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی اعتماد اور

عشق ومحبت قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ملی ہوئی ہوں گی۔

لیکن فرض کیجئے یہ سارے جتن کرنے کے بعد آپ کسی آیت کے بارے میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب تفسیر کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں اور سلف کے اقوال آپ کے اختیار کردہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی ادنی تائید بھی آپ کے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کریں گے؟ کیا روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جائیں گے؟ نہیں ! طالب صادق کی راہ یہ نہیں ہے بلکہ آپ ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کریں گے۔ اس صورت میں گمان غالب تو یہی ہے کہ اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو آپ کی غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کیجئے آپ نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو اپنی ہی تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے اب کیا کریں گے؟ اب خود حدیث پر غور کریں گے۔ اس کو ہر پہلو سے پرکھیں گے۔ ہر کسوٹی پر جانچیں گے۔ انشاء اللہ یہ چیز مفید ثابت ہوگی۔ یا تو آپ کی تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی لیکن طالب کے لئے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں اور ان میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ اس طرح کے مواقع پر عرصہ تک توقف کرنا چاہیئے اور پھر سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے۔ جب قلب پوری طرح سے ایک بات کے لئے کھل جائے کسی طرح کی بھی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہیئے اور پھر اس امر کی ذرا بھی پروا نہیں کرنی چاہیئے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔ (مبادی تدبر قرآن 55-54)

یہاں بھی اصلاحی صاحب اپنے غور و فکر کو صحیح حدیث پر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ اس صحیح حدیث پر دوبارہ نئے سرے سے غور بھی کر لیا ہو اور ہر پہلو سے اس کو چھان پھٹک بھی لیا ہو۔ کیا یہی وہ تدبر قرآن کا اسلوب ہے جس پر ڈاکٹر اسرار صاحب فخر کر رہے ہیں۔